وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور جب اسے سنتے ہیں کہ جو رسول کی طرف اتارا گیا تو تُو دیکھے گا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ کہتے ہیں ہمارے رب ہم ایمان لائے سو تو ہم کو گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔ (868)

وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہمارے پاس کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ایمان نہ لائیں، اور ہم آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ داخل کرے۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

سو اللہ نے ان کو ان باتوں کا بدلہ باغ دیئے جن کے نیچے

868- **نجاشی اور مسلمان مہاجر:** اسی گروہ میں نجاشی شاہ حبش تھا۔ جو مسلمان قریش کی اذیت سے بھاگ کر حبش میں چلے گئے ان کو نجاشی نے پناہ دی۔ ان کے پیچھے قریش بھی پہنچے اور بہت سے تحفے وزراء وغیرہ کو دے کر یہ درخواست کی کہ مسلمانوں کو یہاں امن نہ دیا جائے۔ نجاشی نے اس درخواست کو رد کر دیا تو انہوں نے اس کو یہ کہہ کر اکسانا چاہا کہ یہ لوگ ہمارے مذہب کو ہی برا نہیں کہتے بلکہ تمہارے مذہب کو بھی برا کہتے ہیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلایا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اصل حال کہہ سنایا کہ ہم کس طرح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور گناہوں میں غرق تھے، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں ضلالت سے نکال کر کس طرح اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ تب اس نے پوچھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟ انہوں نے سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے نجاشی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ رو پڑا اور شہادت دی کہ جو کچھ قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا ہے اس سے وہ ایک تنکے کے برابر بڑھ کر نہیں، آخر کار نجاشی مسلمان ہو گیا۔ یہ تو ایک نمونہ ہے اسی طرح کئی لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ گو مقدر یہی تھا کہ عیسائیت جب پورا زور پکڑ لے تو اس کے بعد پھر اسلام کو اس پر پورے طور پر غالب کیا جائے۔ ہاں ایسے نمونے آج بھی بہتیرے ملتے ہیں۔ لارڈ سٹینلے کے حالات میں ایک شخص نے لکھا ہے کہ وہ پچھلی رات تہجد کی نماز میں قرآن شریف پڑھ کر روتا تھا اور بھی آج کئی ایک یورپین عیسائی ہیں جن کے دل قرآن کریم کے سامنے پگھل جاتے ہیں۔

اَلْحَقّ جو اس آیت میں اور اگلی آیت میں آتا ہے۔ اس سے اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس پیشگوئی کی طرف ہے جو یوحنا کے چودھویں اور سولھویں باب میں ہے جس میں موعود نبی کو روح حق کے نام سے پکارا گیا ہے۔

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

نہریں بہتی ہیں انہی میں رہیں گے اور یہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع 11 9 1

اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ستھری چیزیں حرام نہ ٹھہراؤ جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ (869)

وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور اس سے جو اللہ نے تم کو دیا ہے حلال اور ستھری چیزیں کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ

اللہ تمہاری بلا ارادہ قسموں پر تم پر گرفت نہیں کرتا لیکن اس پر

869- رکوع سابق میں عیسائیوں کا اسلام کے قریب ہونا بیان کرتے ہوئے ان کے راہبوں وغیرہ کا محل مدح پر ذکر کیا تھا مگر چونکہ **اسلام رہبانیت کو جائز نہیں ٹھہراتا۔** اس لیے ساتھ ہی مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم اس قسم کی غلطیوں میں نہ پڑنا جن میں یہ عیسائی پڑے ہیں کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے محبت نہیں کرتا، جب تک کہ وہ خداداد نعمتوں اور خداداد طاقتوں کو ترک نہ کرے۔ اس لیے فرمایا کہ جب ستھری چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں تو تم ان کو حرام نہ کرو۔ مثلاً بیوی بچوں کے تعلقات، کھانا پینا وغیرہ جو عبادت میں حد مقررہ سے گزر جاتے ہیں وہ بھی غلو کرتے ہیں۔ مگر اسلام غلو کو جائز نہیں رکھتا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [مَا بَالُ اَقْوَامٍ حَرَّمُوْا النِّسَآءَ وَالطَّعَامَ وَالطِّيْبَ وَالنَّوْمَ] (تفسیر ابن کثیر: جلد3، صفحہ 182) ''ان قوموں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے عورتوں کو اور کھانے کو اور خوشبو کو اور نیند کو حرام کر دیا۔'' اور اس کے آخر پر فرمایا کہ ''میری امت کی رہبانیت جہاد کرنا ہے۔'' اور ایک حدیث میں فرمایا [فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ] (صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب التَّرْغِيبُ فِي النِّكَاحِ: 5063) ''جو شخص میری سنت سے دوسری طرف مائل ہوتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے۔'' پہلی حدیث میں صاف عیسائی قوم کا نقشہ کھینچ کر مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَ احْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

گرفت کرتا ہے جو تم قسم کو مضبوط کرو۔ سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کا کھانا ہے۔ درمیانہ کھانے سے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو لباس دینا یا گردن کا آزاد کرنا اور جو شخص نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ (870)

870- عَقَّدْتُّمُ۔ عَقْدٌ کے معنی کسی چیز کی دونوں طرفوں کو اکٹھا کرنا یا گرہ دینا ہیں اور استعارۃً بیع، عہد، قسم وغیرہ کے مؤکد کرنے پر عَقْدَ۔ عَقَّدَ۔ عَاقِدٌ وغیرہ بولا جاتا ہے۔ (غ) سورہ بقرہ میں ﴿عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ کی جگہ جہاں مضمون یہی ہے ﴿كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ [البقرۃ: 225:2] ''تمہارے دلوں نے کمایا'' فرمایا یعنی ٹھان کر یا ارادہ اور عمد سے ایک کام کا کرنا۔

كَفَّارَةُ۔ كُفْرٌ کے معنی چھپانا اور كَفَّارَةٌ وہ ہے جو گناہ کو چھپا دے۔ اسی سے قسم کا کفارہ ہے۔ (غ)

اَوْسَطِ۔ وَسَطٌ یا اَوْسَطُ کے معنی درمیان کی چیز ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں یہاں وسط سے مراد قلت و کثرت میں وسط ہے اور وہ کہتے ہیں کہ کفارہ میں نبی کریم ﷺ کی سنت اسی اندازے سے دے دینا تھا نہ لازمی طور پر کھانا پکا کر کھلانا اور زیادہ سے زیادہ اندازہ جو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا ہے نصف صاع یا دو مُدّ فی مسکین ہے اور کم سے کم ایک مد جو 9 چھٹانک ہے۔

تَحْرِيْرُ [نمبر: 408] ایک انسان کا آزاد کر دینا۔ رَقَبَةٍ کے لیے [دیکھو نمبر: 215] چونکہ قیدی جب پکڑا جاتا تھا تو اس کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے تھے۔ اس لیے رَقَبَةٍ جو گردن کے معنی میں ہے غلام پر بولا جانے لگا۔ (ج)

حَلَفْتُمْ۔ حَلَفٌ اصل میں وہ قسم تھی جو ایک دوسرے سے عہد کے وقت لی جاتی تھی، پھر ہر قسم پر بولا جانے لگا۔ اسی لیے حلیف وہ ہے جس سے عہد کیا ہو۔ (غ)

لغو قسم کے معنی پہلے گزر چکے ہیں [دیکھو نمبر: 288]۔ یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ بسا اوقات لوگ بلا ارادہ قسم کھا کر ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ خدا کی قسم میں فلاں چیز نہیں کھاؤں گا وغیرہ۔ ہاں جب انسان پختہ طور پر اور پورا عزم کر کے ایک قسم کھالے تو پھر کفارہ دینا چاہیے۔ مگر قسم کے کفارہ کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک جائز عہد کر کے اس پر قسم کھالیتا ہے تو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک کام صرف شیطان کے عمل سے ہیں سو اس سے بچو تا کہ تم کامیاب ہو۔ (871)

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے سے عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے، سو کیا تم رک جاؤ گے۔ (872)

کفارہ دے کر اس کو بھی توڑ دے اور اس کا توڑنا تو کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ قسم کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔ ہاں قسم کھا کر ایک جائز چیز کو اپنے لیے ناجائز کہہ دیا تو ایسی قسم کا کفارہ دے۔ کیونکہ جائز کا ناجائز کرنا خلاف حکم خداوندی ہے۔ قسموں کی حفاظت سے مراد یہ بھی ہے کہ قسم کو توڑو نہیں۔ اور یہ بھی مراد ہے کہ قسم کم کھاؤ۔

871- رِجْسٌ۔ پلیدی یا ناپاکی۔ جسے انسان کی طبیعت پلید قرار دے یا عقل یا شریعت۔ (غ) خمر اور میسر آخری دو لحاظ سے رجس ہیں۔ ایسا ہی انصاب و ازلام۔

اَلْاَنْصَابُ اور الْاَزْلَامُ کا ذکر پہلے شروع سورت میں بھی آیا ہے۔ انصاب سے مراد وہ پتھر ہیں جن کی عبادت کرتے تھے اور ازلام سے مراد ان تیروں کے ذریعہ سے فال کا نکالنا جن پر لَا، نَعَمْ وغیرہ لکھا ہوتا تھا۔ [دیکھو نمبر: 785] چنانچہ حدیث کے الفاظ میں [شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوَثَنِ] (مصنف ابن ابی شیبة، جلد8، صفحہ5، حدیث:24544) اسی طرف اشارہ ہے یعنی شراب کا پینے والا بتوں کے پوجنے والے کی طرح ہے۔ بت پرستی کو شراب کے ساتھ ممنوع ٹھہرا کر بتایا ہے کہ مسلمانوں کو شراب سے ایسا ہی بچنا لازمی ہے جیسے بت پرستی سے۔

یہ چیزیں تو پہلے حرام کی جا چکی ہیں یہاں دہرا کر یہ اشارہ کیا ہے کہ وہ عیسائی جنہوں نے ایک وقت رہبانیت اختیار کر کے حلال **چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا**، ایک دوسرا وقت آنے والا ہے کہ اس قدر دنیا میں غرق اور خدا سے دور ہوں گے کہ حرام کو بھی حلال کر لیں گے۔ اس لیے مسلمانوں کو شراب اور جوئے سے بالخصوص روکا ہے گو بتوں اور فال کے تیروں کا بھی ساتھ ذکر کیا ہے۔ مگر اگلی آیت میں صرف شراب اور جوئے کے نقصانات کو بیان کر کے بتا دیا ہے کہ اصل غرض انہی سے روکنا ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول پر حرمت شراب کی عام منادی کرائی گئی۔ تو اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں تمام کی تمام شراب بہا دی گئی۔ [دیکھو نمبر: 281]

872- جن قوموں نے شراب اور جوئے میں ترقی کی ہے۔ اللہ کے نام تک کو بھول گئی ہیں، ذکر تو ایک طرف رہا۔ اور پھر ظاہر نقصان یہ

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور بچتے رہو۔ پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع 12 7 2

ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے کوئی گناہ نہیں اس بارے میں جو وہ کھائیں جب کہ وہ تقویٰ کریں اور ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں پھر تقویٰ کریں اور مان لیں پھر تقویٰ کریں اور احسان کریں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (873)

بھی ہے کہ شراب اور جوئے سے باہم عداوت اور بغض پیدا ہوتا ہے جس کا یورپ آج کھلا نقشہ دکھا رہا ہے۔ اس مقابلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سرور جس کو شراب خوار شراب میں تلاش کرتا ہے وہ اللہ کے ذکر میں ہی میسر آتا ہے۔

873- اس آیت سے عموماً مراد یہ لی گئی ہے کہ جو لوگ تحریم خمر سے پہلے وفات پا گئے ان پر کوئی گناہ نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یوں تو اور بیسیوں احکام ہیں جن کے نازل ہونے سے پہلے بعض مسلمان فوت ہو گئے وہ ان پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے زیر مؤاخذہ نہ تھے جو اس حکم کی ضرورت پڑتی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تقویٰ کریں تو حرج نہیں کہ اتنی تھوڑی سی شراب پی لیں جس سے عداوت اور بغض پیدا نہ ہو۔ یہ بھی خوب تقویٰ ہے رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ جب شراب کو رجس قرار دیا، جب اس کو بت پرستی کے ساتھ ملا کر اس کی حرمت کو بیان کیا، جب صاف کہہ دیا کہ اس سے بچو۔ تو تقویٰ اور شراب خوری ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

مراد اس آیت سے کیا ہے؟ اوپر حلال چیزوں کو حرام کرنے والوں کا ذکر تھا۔ اس لیے یہاں فرمایا کہ کھانے پینے سے انسان گنہگار نہیں ہوتا جو ان چیزوں کا ترک کرنا بھی تقرب الی اللہ میں داخل ہو۔ چنانچہ سلف میں سے بعض اس طرف گئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے لیے گوشت حرام کر لیا تھا اور راہبانہ طریق اختیار کرنا چاہتے تھے۔ سو یہاں ایسے لوگوں کی غلطی کو بھی ظاہر کر دیا۔ ہاں قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی راہ بھی ساتھ ہی بتا دی اور اس میں **تقویٰ کے تین مراتب** بھی بیان کر دیئے۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔ دوسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہے کہ تمام باتوں کو مان لے اور کسی پر اس کے دل میں خلش پیدا نہ ہو یعنی سب احکام الٰہی کی فرمانبرداری اختیار کرے اور تیسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرے۔ رہبانیت میں زیادہ سے زیادہ پہلا مرتبہ تقویٰ کا آ سکتا ہے کہ ایمان لا کر کچھ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کچھ شکار سے تمہیں ضرور آزمائے گا جس کو تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں تا کہ اللہ جان لے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے، سو جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (874)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شکار کو نہ مارو جب تم حالت احرام میں ہو اور جو کوئی تم میں سے اسے جان بوجھ کر مارے تو (اس کا) بدلہ چار پایوں سے اس کا مثل ہے جو مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عدل والے کریں یہ

اچھے کام کر لیے مگر کل احکام الٰہی کی فرمانبرداری راہب کیونکر کر سکتا ہے۔ پھر اس آخری مرتبہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کو وہ کیونکر پا سکتا ہے۔ مسلم، ترمذی، نسائی میں ایک حدیث ہے جو اسی معنی کی مؤید ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کہا گیا ہے کہ تو بھی ان میں سے ہے، یعنی یہ تینوں مراتب تقویٰ تم میں پائے جاتے ہیں۔

874- اس رکوع میں اصل ذکر خانہ کعبہ کی عزمت وحرمت کا ہے۔ اسی کے متعلق یہ احکام شکار بھی ہیں۔ اس مضمون کو بھی عیسائیت کے ذکر سے خاص تعلق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال میں ایک عیسائی بادشاہ نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا ذکر سورۂ فیل میں ہے۔ پھر آخری زمانہ میں غلبہ عیسائیت کی صریح پیشگوئیاں قرآن شریف اور حدیث میں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ عیسائیت کے غلبہ سے خانہ کعبہ کی حفاظت کا سوال پھر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے عیسائی مذہب کے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

خانہ کعبہ کی حرمت کو اس قدر بلند مقام پر رکھا ہے کہ حالت احرام میں شکار کو بھی منع کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے موقعہ پر جب آدمیوں کا اس قدر اجتماع ہو شکار کھیلنا ویسے بھی نقصان جان کا موجب ہو سکتا ہے۔

ہاتھوں کے پہنچنے سے مراد جال وغیرہ سے شکار کا پکڑنا ہے۔ اور یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے ہاتھ سے ہی پکڑے اور نیزے کے شکار سے مراد ایسا شکار ہے جو اسے زخمی کر کے حاصل کیا جائے۔ تیر اور بندوق بھی اس میں آ جائیں گے۔ مجاہد کہتے ہیں پہلے سے مراد چھوٹا شکار دوسرے سے بڑا ہے۔ (ج)

كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

قربانی کعبہ پہنچنے والی ہو یا کفارہ ہے مسکینوں کا کھانا یا اس کے برابر روزے رکھنا تاکہ اپنے کام کا برا نتیجہ چکھے۔ جو گزر گیا وہ اللہ نے معاف کر دیا۔ اور پھر جو ایسا کرے تو اللہ اس کو اس کی سزا دے گا اور اللہ غالب سزا دینے والا ہے۔(875)

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا طعام حلال کیا گیا ہے تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لیے(876) اور تم پر خشکی کا شکار حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالت احرام میں ہو اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

875- یہاں پہلی آیت کے حکم کی تصریح کر دی ہے اور **حالت احرام میں شکار کرنا** منع کیا ہے۔ درندوں یا موذی جانوروں کو مارنا اس میں شامل نہیں ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایسی صورت میں سزا کیا ہے۔ کسی جانور کی قربانی کعبہ میں جو مقتول جانور کی مثل ہو جس کا فیصلہ دو صاحب عدل کریں۔ صاحب عدل سے مراد ایسے لوگ ہیں جو فقاہت رکھتے ہوں اور حقوق کا موازنہ کر سکتے ہوں۔ خاص حالات میں قربانی ہو یا مساکین کا کھانا یا روزے اور کس قدر، یہ سب فیصلہ انہی دو آدمیوں پر چھوڑا ہے۔ قرآن کریم نے عموماً ایسے فیصلوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو رکھا ہے۔ یہاں بھی دو کو رکھا ہے اور طلاق کے معاملہ میں بھی دو کو۔ منشا یہ ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے سے آراء کا مقابلہ کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ایک سے غلطی کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے۔ ججوں کے بنچ بٹھانا کوئی نیا خیال نہیں۔

876- طَعَامٌ۔ طَعِمَ کے معنی غذا کے طور پر کسی چیز کو لینا ہیں اور طعام وہ چیز ہے جو اس طرح لی جائے۔ (غ) مگر سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا ابن عباس، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرھم سے مروی ہے کہ صَيْدُهٗ وہ ہے جس کا شکار کر کے اسے مارا جائے اور طعام وہ ہے جسے دریا خود پھینک دے یا دریا کے پیچھے ہٹ جانے سے رہ جائے۔ (ج)

سَيَّارَةٍ۔ سَيْرٌ سے ہے زمین میں چلنا۔ اور جو جماعت زمین میں چلے اسے سیارۃ کہا جاتا ہے ﴿وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ﴾ [یوسف: 19:12] ''اور ایک قافلہ آیا۔''

آبی شکار کو مستثنیٰ کر دیا ہے یعنی اس کا پکڑنا حالت احرام میں جائز ہے۔ دریا وغیرہ کے شکار میں اتلاف جان کا خطرہ نہیں۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآىِٕدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

اللہ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لیے قائم رکھنے والا بنایا ہے اور حرمت والے مہینوں کو اور قربانیوں کو اور گانیوں والے جانوروں کو۔ یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (877)

877- اَلْكَعْبَةَ۔ كَعَبٌ ٹخنے کو کہتے ہیں یعنی وہ ہڈیاں جو پنڈلی اور قدم کے درمیان اٹھی ہوئی ہوتی ہیں اور [كَعَبَتِ الْجَارِيَةُ] اس لڑکی کے متعلق کہا جاتا ہے جس کے سینہ کا ابھار شروع ہو گیا ہو۔ اسی لحاظ سے كَعَبٌ شرف اور علو کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے: [لَا يَزَالُ كَعْبُكَ عَالِيًا] (تفسیر قرطبی: 976) جو دعائے شرف وعلو ہے [وَكُلُّ شَيْءٍ عَلَا وَارْتَفَعَ فَهُوَ كَعْبٌ] یعنی ہر ایک چیز جو بلند اور مرتفع ہو وہ کعب ہے۔ (ل) اور كَعْبَةٌ کو اس کے ارتفاع اور مربع ہونے کے لحاظ سے ایسا کہا جاتا ہے۔ (ل) مگر اصل یہی ہے کہ یہ نام صرف اس کے علو اور ارتفاع کی وجہ سے ہے اور علو اور ارتفاع سے مراد ظاہری بلندی نہیں بلکہ درجہ میں علو ہے، کیونکہ اس گھر کو ابتدا سے علو اور ارتفاع کا مرتبہ حاصل رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کعبہ اس کا نام بطور پیشگوئی کے رکھا گیا کہ اس کو دنیا میں علو اور ارتفاع حاصل ہوگا اور مربع ہونا کوئی خصوصیت نہیں جس کی وجہ پر یہ نام رکھا جاتا۔

﴿قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ کسی چیز کے لیے قیام ہونا اس کی نگہداشت اور حفاظت کرنا ہے۔ (غ) پس ﴿قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ کے معنی ہوئے لوگوں کی نگہداشت اور حفاظت کا ذریعہ۔ اصم نے اس کے معنی کیے ہیں قَآئِمًا یعنی خود قائم رہنے والا یا کبھی منسوخ نہ ہونے والا۔ (غ) یعنی نہ کبھی یہ برباد ہوگا اور نہ اس کے بعد کوئی اور دین دنیا میں قائم ہوگا کہ یہ منسوخ ہو جائے۔

اس آیت میں اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ **کعبہ کو خدا نے قیام بنایا ہے**۔ گویا یہ لوگوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ یہاں خاص اہل عرب کا ذکر نہیں کیا بلکہ سب لوگوں کے لیے قیام کہا ہے۔ اس لیے صرف اس قدر مراد نہیں ہو سکتی کہ عرب کے لوگوں کے لیے یہ معاش کا ذریعہ ہے اس لیے کہ تجارت کا مرکز ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جس طرح غذائیں جسمانی قیام کا موجب ہیں اسی طرح خانہ کعبہ لوگوں کے روحانی قیام کا موجب ہے۔ جس کے ذریعہ سے دنیا کے امور دینی کی اصلاح ہوئی اور یہ بالکل سچ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ پیدا نہ ہوتے تو توحید اور روحانیت کا نام دنیا سے مٹ جاتا۔ پس یوں خانہ کعبہ دنیا کی روحانی زندگی کا موجب ہو کر دنیا کے لیے قیام کا موجب ہو گیا اور اسی لیے خانہ کعبہ کو بربادی سے بھی ہمیشہ کے لیے بچایا گیا۔ کیونکہ اس کو ظاہری نشان اس بات کا ٹھہرایا گیا کہ حق کبھی تباہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح قیام اپنے دونوں معنوں کی رو سے خانہ کعبہ پر صادق آتا ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے برباد نہ کر سکے گی اور جو روحانیت اس سے پیدا ہوئی ہے وہ بھی کبھی برباد نہ ہوگی

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾

جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے اور کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(878)

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

پیغمبر پر سوائے پہنچا دینے کے کچھ نہیں اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع 13 7 3

کہہ ناپاک اور ستھرا برابر نہیں گو تجھے ناپاک کی بہتات تعجب میں ڈالے۔ سو اے عقل والو! اللہ کا تقویٰ کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔(879)

بلکہ دنیا کی زندگی کا موجب ثابت ہوگی۔

باقی تین چیزوں کا ذکر بھی یہی بتانے کو ہے کہ نہ صرف خانہ کعبہ ہی آخر دنیا تک قائم رہے گا بلکہ وہ چیزیں بھی جن کا اس سے تعلق ہے۔ حرمت والے مہینے جن میں حج کیا جاتا ہے اور ہدی اور قلائد جن کی قربانی کی جاتی ہے۔ پس مراد اس سے یہ ہے کہ **اس کا حج بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا** اور اس کے حج کا بند ہونا لوگوں کی ہلاکت کی نشانی ہوگی۔ یہاں حاجیوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ ایام حج اور قربانیوں کا ذکر کر دیا ہے جب ان کی بھی حفاظت ہوگی تو حاجیوں کی خود حفاظت ہوئی۔ چنانچہ عطاء سے یہ معنی مروی ہیں کہ جب تک لوگ اس گھر کا حج کرتے رہیں گے ہلاک نہیں ہوں گے اور جب حج ترک ہو جائے گا تو ہلاک ہو جائیں گے۔

اس کو بڑی عظیم الشان پیشگوئی قرار دیا ہے یعنی اس کی صداقت سے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے۔ ایسا دعویٰ کسی گھر کے متعلق دنیا میں نہیں کیا گیا اور کیا عجیب بات ہے کہ باوجود ہزارہا قسم کے منصوبوں کے کوئی شخص خانہ کعبہ کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ عیسائیوں پر یہ سب سے بڑھ کر اتمام حجت ہے کیونکہ سب سے زیادہ طاقت ان کو دی گئی ہے اور سب سے بڑھ کر زور بھی انہوں نے ہی لگایا ہے۔ اشاعت مذہب کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ ملکی طور پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس میں ناکام ہوں گے۔

878- اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کعبہ کو نقصان پہنچانا چاہو گے تو اللہ کی طرف سے سخت سزا آئے گی مگر اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔ کئی قصوروں سے درگزر بھی کرتا رہتا ہے۔

879- ناپاک کی کثرت اب بھی ایک عالم کو تعجب میں ڈالے ہوئے ہے، مگر ناپاک اور طیب برابر نہیں اور طیب آخر کار غالب آئے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! (بہت) چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں تکلیف دیں اور اگر تم ایسے وقت میں ان کے متعلق سوال کرو جب قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے اسے معاف کر دیا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ (880)

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

تم سے پہلے ایک قوم نے ان (باتوں) کا سوال کیا۔ پھر ان کا انکار کرنے والے ہو گئے۔ (881)

880- اس ساری سورت میں شریعت پر زور دیا ہے اور اس کی تفصیلات کو بیان کیا ہے۔ مگر قرآن کریم نے ہر جگہ افراط و تفریط کے پہلوؤں کو مدنظر رکھا ہے۔ جس طرح پچھلے سے پچھلے رکوع میں عبادت میں غلو کو روکا اسی طرح یہاں تفصیلات شریعت میں غلو کو روکتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تم بہت سوال نہ کیا کرو۔ اللہ خود جن احکام کو انسانوں کی رہبری کے لیے ضروری سمجھتا ہے دے دے گا۔ جس طرح شریعت کا نہ ہونا انسان کے لیے موجب تکلیف ہے۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے امور میں احکام شریعت موجب تکلیف ہو جاتے ہیں۔ اسلامی شریعت نے اعتدال کا پہلو اختیار کیا ہے۔ ضروری تفصیلات دے بھی دی ہیں، مگر بہت سی باتوں کو چھوڑ بھی دیا ہے تاکہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے۔ اور چونکہ احکام قرآنی میں تو تبدیلی ہو نہیں سکتی، لیکن اجتہاد حالات زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور بلاشبہ بہت سے تفصیلی امور میں تبدیلی حالات کے لحاظ سے تبدیلی حکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہی طریق امن تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں احکام قرآنی نہ دیئے جاتے اور ضروریات پیش آمدہ کے مطابق اجتہاد سے کام لیا جاتا۔ حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے چھوٹے چھوٹے سوالات کیا کرتے تھے جس پر آپ اظہار ناراضگی فرماتے وہ بھی اسی کا مؤید ہے۔

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا﴾ سے یہ مراد ہے کہ باوجود تمہارے ایسے سوالوں کے اللہ تعالیٰ نے تم پر مشقت نہیں ڈالی۔

881- پہلی قوم سے جب نام نہ لیا جائے عموماً بنی اسرائیل ہی مراد ہیں۔ ان کی شریعت میں بہت سے چھوٹے چھوٹے امور کا ذکر ہے شاید وہ ایسے سوال بھی کرتے ہوں۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جیسے عیسائیوں نے مائدہ کا سوال کیا پھر ناشکری کی۔ (ج)

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيۡلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ وَ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

اللہ نے نہ کوئی بحیرہ بنایا ہے اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام لیکن جو کافر ہوئے وہ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔[882]

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، کہتے ہیں ہمارے لیے وہ بس ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا۔ کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ ۚ لَا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی جانوں کی فکر کرو۔ جو گمراہ

882- بَحِيۡرَةٍ۔ بَحْرٌ سے ہے جس کے معنی شق کرنا ہیں جس اونٹنی کا کان چیرا جائے اسے بَحِيۡرَةٌ کہتے تھی یعنی جب اونٹنی دس بچے جنتی اور آخری نر ہوتا تو اونٹنی کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا اور اس سے کسی قسم کا کام نہ لیا جاتا۔

سَآئِبَةٍ۔ سَابَ سے ہے جس کے معنی ہیں زمین پر چلا۔ وہ اونٹنی جو نذر مان لینے کی وجہ سے یا دس مادہ بچے جننے کی وجہ سے آزاد چھوڑ دی جاتی اور کسی چارہ یا پانی سے اس کو نہ روکا جاتا۔

وَصِيۡلَةٍ۔ وَصَلُ سے ہے جس کے معنی ملانا ہیں۔ اس کی بہت سی تشریحات کی گئی ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ بکری ہے جو سات دفعہ دو دو بچے جنے۔ آخر میں اگر ایک نر اور ایک مادہ ہو تو ماں کا دودھ صرف مرد پیتے اور زجاج نے کہا کہ وہ وہ بکری ہے جو نر جنتی تو دیوتاؤں پر چڑھایا جاتا۔ لیکن اگر مادہ کے ساتھ نر ہوتا تو پھر اسے بچا لیا جاتا۔

حَامٍ۔ حِمٰی سے ہے محفوظ رکھنا۔ وہ نر جس سے سواری کا کام نہ لیا جائے۔ عموماً ایسے نر جن کی نسل شروع ہو جاتی یا دس بچے ایک مادہ سے ہو جاتے ان سے پھر سواری کا کام نہ لیتے تھے۔

یہ تمام رسوم شرک سے تعلق رکھتی تھیں۔ گویا بتا دیا کہ گو تفصیلات شریعت میں آزادی بھی بہت دی ہے مگر شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہے اس لیے اس کے متعلق ہر قسم کی رسوم جڑ سے کاٹنی ضروری ہیں۔ مسلمان غور کریں کہ **مشرکانہ رسوم** سے اللہ تعالیٰ نے کس قدر بچنے کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے گھروں میں کس طرح مشرکانہ رسوم جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔

يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ہو او ہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تم ہدایت پر ہو۔ تم سب نے اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے سو وہ تم کو اس کی خبر دے گا جو تم کرتے تھے۔ (883)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہاری آپس میں گواہی وصیت کے وقت جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ موجود ہو دو اپنوں میں سے صاحب عدل لوگوں کی ہے۔ یا کوئی اور دو تمہارے غیر میں سے اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو پھر تم کو موت کی مصیبت پہنچے۔

883- **ضال قوم کی کثرت کے وقت علاج:** ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت ان قوموں کے لیے ہے جو بعد میں آنے والی ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یہ آخری زمانہ کے لیے ہے۔ (ج) اور یہی بات حق بھی معلوم ہوتی ہے ﴿لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ﴾ میں بتا دیا ہے کہ جب ضالین کی کثرت ہو تو یہ مت گمان کرو کہ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں بشرطیکہ تم خود ہدایت پر قائم ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کو ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہدایت پر ہونے کا ایک جزو لازم ہے کہ دوسروں کو ہدایت کی طرف بلائے ﴿وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ [العصر: 3:103] ''اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں۔'' بلکہ ہدایت کی طرف بلانے میں تکلیفیں اٹھائے ﴿وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر: 3:103] ''اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔'' پس یہ آیت مسلمانوں کو یہ نہیں بتاتی کہ جب چاروں طرف ضلالت پھیلی ہوئی دیکھو تو تم اپنی ہی فکر کرو۔ دوسروں کو دین کی طرف نہ بلاؤ بلکہ یہ مسلمانوں کی ایک گری ہوئی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب ضالین ان کے چاروں طرف ہوں گے اور ان کو بتایا ہے کہ تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ دوسروں کی وجہ سے نہیں۔ تم اپنی فکر کرو اپنے حالات کو درست کرو خود ہدایت پر قائم ہو جاؤ پھر تم کو کوئی ضال نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کاش آج مسلمان اس پر توجہ کریں اور بجائے دوسروں کا رونا رونے کے پہلے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ نبی کریم ﷺ سے جو تفسیر اس آیت کی ایک حدیث میں آئی ہے وہ بھی یہی بتاتی ہے۔ ترمذی میں ہے آپ نے فرمایا: [اِئْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتّٰى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُّطَاعًا وَّهَوًى مُّتَّبَعًا وَّدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَّإِعْجَابَ كُلِّ امْرِئٍ بِرَأْيِهٖ فعَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ ضَلَالَةُ غَيْرِكُمْ] (سنن أبي داؤد، الملاحم، باب الأَمْرِ وَالنَّهْيِ: 4343) یعنی نیک باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے روکو پھر جب تم دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جاتی ہے اور حرص و ہوا کی پیری کی جاتی ہے اور ہر ایک شخص اپنی رائے پر خوش ہے تو تم اپنی جانوں کی فکر کرو، غیروں کی ضلالت تمہیں

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

ان دونوں کو تم نماز کے بعد روک لو۔ پس اگر تم کو شک ہو تو دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس کے عوض کچھ قیمت نہ لیں گے۔ گو وہ قریبی ہو اور ہم اللہ کی شہادت کو نہ چھپائیں گے۔ بے شک اس صورت میں ہم گنہگاروں میں سے ہوں گے۔ (884)

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا

پھر اگر معلوم ہو کہ ان دونوں نے گناہ سے حق لیا ہے تو دو اور

نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس حدیث کے آخر میں بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری زمانہ کے لیے اور مسند احمد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ تم اس آیت سے غلط مطلب نکالتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جب بری بات کو دیکھ کر لوگوں کو اس سے نہیں روکیں گے اللہ تعالیٰ ان پر ایسی سزا بھیجے گا جو سب کو شامل کر لے گی۔ (ث) ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں [اِحْفَظُوْهَا وَالْزَمُوْا صَلَاحَهَا] یعنی اپنی حفاظت کرو اور اپنی اصلاح کرو۔ یعنی ایک دوسرے کو امر و نہی کے احکام سناؤ۔

884- کہا جاتا ہے یہ آیت تمیم داری اور اس کے بھائی عدی کے بارہ میں نازل ہوئی۔ مگر کہنا یوں چاہیے کہ وہ قصہ بھی اس آیت کے ماتحت آتا ہے اور آیت عام ہے۔ اس آیت میں وصیت کے متعلق شہادت کا حکم ہے۔ اس کے یہاں لانے کی یہ وجہ ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے سوالات سے روکا تو اب خود ہی یہ بھی بتا دیا کہ ضروری احکام کو قرآن شریف نے خود بیان کر دیا ہے۔ ایک طرف شرک کے متعلق ہر قسم کے رواجات کو روکا تو دوسری طرف حفاظت مال کے قوانین کی بھی ضروری تفصیلات کو بیان کر دیا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وصیت کا حکم جو سورۃ بقرہ میں ہے وہ کبھی منسوخ نہیں ہوا کیونکہ اس آیت کا نزول آیت توریت سے بہت بعد کا ہے۔

﴿اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ﴾ میں گواہی اپنوں کی یعنی مسلمانوں کی بھی جائز رکھی ہے اور **غیروں کی یعنی غیر مسلموں کی بھی** اور یہ جو فرمایا ﴿اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ یعنی سفر کی حالت میں ہو۔ تو یہاں صرف ایک سخت ضرورت کی حالت کو بیان کیا ہے۔ یہ شرط نہیں کہ اس کے سوائے گواہ یا وصیت نہ ہو۔ تَحْبِسُوْنَهُمَا میں جو روکنے کا ذکر ہے وہ شہادت لینے کے وقت ہے۔ نماز کے بعد اس لیے کہا کہ نماز میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ معاملہ ایک مشکوک شہادت کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ صلوٰۃ سے مراد ہر ایک اہل دین کی اپنی اپنی صلوٰۃ ہے یعنی اگر گواہ عیسائی ہوں تو ان کے مذہب کی صلوٰۃ کے بعد۔ پس یہاں مراد صلوٰۃ سے مطلق دعا ہی لینا چاہیے۔

فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

ان دو کی جگہ کھڑے ہوں ان میں سے جن سے دو پہلوں نے (گناہ سے) حق لیا ہے سو وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم حد سے نہیں بڑھتے بیشک اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔ (885)

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا ۭ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع 14 8 4

یہ بہت قریب (طریق) ہے کہ وہ شہادت کو سچ سچ ادا کریں یا ڈریں کہ ان کی قسموں کے بعد اور قسمیں لوٹائی جائیں گی۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو اور سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (886)

885- عُثِرَ۔ [عُثِرَ الرَّجُلُ] کے معنی ہیں وہ گر گیا۔ پھر اس کا استعمال اس پر ہوتا ہے جو بغیر طلب کرنے کے کسی امر پر اطلاع پائے۔ (غ)

اِسْتَحَقَّ۔ [اِسْتَحَقَّ الشَّیْءَ] کے معنی ہیں اِسْتَوْجَبَهٗ یعنی اسے واجب کرلیا۔ (ل) پس ﴿اِسْتَحَقَّآ اِثْمًا﴾ سے مراد ہوئی کہ انہوں نے گناہ کو اپنے اوپر واجب کرلیا ہے یعنی گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور ﴿الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ﴾ میں اَوْلَیٰنِ۔ اِسْتَحَقَّ کا فاعل ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اِثْمٌ جو ابھی آ چکا ہے اور عَلَيْهِمُ سے مراد ان کے خلاف ہے۔ پس جملہ کے معنی یوں ہوئے کہ دو اور گواہ ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کے خلاف پہلے دو نے ارتکاب جرم کیا ہے یعنی وارثان میت سے۔

یہاں یہ بتایا ہے کہ گواہوں کی گواہی جب اس کے خلاف قرائن ہوں دوسرے گواہوں سے رد کی جاسکتی ہے، یہ نہیں کہ جھوٹے گواہوں کی گواہی کا کوئی علاج نہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے گواہوں کے جھوٹ بولنے پر کوئی قرینہ ہے تو وہ لوگ جو مال کے حقدار ہیں ان کے خلاف گواہ پیش کرسکتے ہیں۔

886- شہادت کے ﴿عَلٰى وَجْهِهَآ﴾ ادا کرنے سے مراد اس کا سچ سچ ادا کرنا ہے اس قانون کے ماتحت ہر گواہ کو یہ فکر ہوگی کہ اس کی گواہی اگر وہ جھوٹ بولے تو رد بھی ہوسکتی ہے۔ قسموں کے لوٹائے جانے سے مراد قسموں کا دوسروں کی طرف لوٹانا ہے یعنی اور گواہ بلائے جائیں گے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا اور کہے گا تمہیں کس طرح قبول کیا گیا کہیں گے ہمیں کوئی علم نہیں۔ تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔(887)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ

وقف لازم

جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! میری نعمت کو یاد کر (جو میں نے) تجھ پر اور تیری ماں پر (کی) جب میں نے روح القدس کے ساتھ تیری تائید کی تو لوگوں سے جھولے میں اور بڑھاپے میں باتیں کرتا تھا۔ اور جب میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائی اور جب تو میرے حکم سے مٹی سے پرند کی صورت کی مانند اندازہ کرتا پھر اس میں پھونکتا سو وہ میرے حکم سے اڑنے

887- ﴿مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾۔ اِجَابَتْ کے معنی قبول کرنا ہیں۔ جیسے ﴿اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ﴾[الأحقاف: 31:46] ''اللہ کی طرف بلانے والے کو قبول کرو۔'' پس یہاں معنی [بِاَيِّ اِجَابَةٍ اُجِبْتُمْ] کس قسم کی قبولیت سے تمہیں قبول کیا گیا اور جواب دینا مراد نہیں ورنہ مَاذَا کی جگہ بِمَاذَا ہوتا۔

اس رکوع میں اصل غرض تو عیسائیوں کا انہماک لذات دنیوی کا بیان کرنا ہے۔ لیکن اس کا آغاز ایک عام بیان سے کیا ہے کہ قیامت کے دن سب رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری قبولیت جو تمہارے پیروؤں نے کی کس رنگ میں کی تھی۔ یعنی آیا ان کے مدنظر رضائے الٰہی تھی یا دنیا کی طرف جھک گئے اور حق کو چھوڑ دیا۔ اگلے رکوع میں یہی عام سوال خصوصیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیا ہے۔ یہاں بھی سوال کی اصل غرض عیسائیوں کی حالت کی طرف توجہ دلانا ہے۔ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قبول تو یہاں تک کرتے ہیں کہ غلو کر کے بشر سے خدا بنا دیا۔ مگر زندگی کی غرض صرف دنیا اور اس کی لذات کا حصول ہے اور سوال مائدہ میں بھی اسی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں کا جواب ہے کہ ہمیں کوئی علم نہیں۔ کیونکہ جو کچھ ان کی امتوں نے ان کے بعد کیا اس کا علم صرف عَلَّامُ الْغُيُوْبِ کی ذات کو ہی ہو سکتا ہے اور یہ سوال محض پیغمبروں کی امتوں پر بطور اتمام حجت ہے کہ انبیاء علیہم السلام ان میں کس غرض کے لیے آئے تھے اور ان کا قدم کدھر جا رہا ہے۔ اگلا رکوع اسی کی مزید تشریح کرتا ہے اور خود اس رکوع کی [آیت: 111, 112] بھی یہی بتاتی ہے۔

تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

والا ہو جاتا اور تو شب کور اور مبروص کو میرے حکم سے اچھا کرتا اور جب تو میرے حکم سے مردوں کو نکالتا۔ اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا۔ جب تو ان کے پاس دلائل لے کر آیا تو جو ان میں سے کافر ہوئے انہوں نے کہا یہ صرف کھلا جادو ہے۔ (888)

888- كَفَفْتُ۔ كَفَّ کے اصل معنی ہاتھ سے یعنی کَفّ سے روکنا ہیں پھر عام ہوگیا ہے یعنی کس طرح پر روکنا۔ (غ) اس لفظ کے استعمال سے بھی یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر چلے گئے کیونکہ بنی اسرائیل کو روکنا بتاتا ہے کہ وہ ان کو پکڑ نہیں سکے اور نہ ان کو ہاتھ لگا سکے۔ یہ استدلال بہت ہی عجیب ہے گویا سب پیغمبروں کو تو ان کے دشمن ایذائیں پہنچاتے رہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کچھ ایسے نرالے رسول تھے کہ کسی دشمن کا ہاتھ بھی ان کو نہ چھو سکا۔ بنی اسرائیل کو روکنے کا منشا تو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے منصوبہ میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کیا کامیاب نہ ہو سکے۔ ورنہ جو حالات دشمنوں سے سخت ترین تکلیفیں اٹھانے کے اوروں کو پیش آئے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی آئے۔ باوجود وعدہ ﴿يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المآئدة: 67:5] ''تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا'' کے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زخم کھا کر گر جاتے ہیں اور مشہور ہو جاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے۔ اگر ایک یہودی عورت آپ کو زہر دے سکتی ہے تو كَفَفْتُ میں کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا۔ اگر یہودی مسیح کو پکڑ کر صلیب سے لٹکا دیں مگر اللہ تعالیٰ آپ کی جان بچا لے۔

سِحْرٌ۔ سِحْرٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 129]۔ کفار انبیاء کو ساحر ہی کہتے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے ﴿يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ﴾ [الزخرف: 49:43] ''اے جادوگر!'' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ساحر کہتے تھے۔ چنانچہ سورۂ یونس کے شروع میں ہے کہ لوگوں کو اس پر کیوں تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے ایک شخص کی طرف وحی کی ہے کہ بدکرداروں کو ڈرائے اور نیکوں کو خوشخبری دے اور جب رسول یہ پیغام دیتا ہے تو کافر کہتے ہیں ﴿اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ﴾ [یونس: 2:10] ''یہ تو صریح جادوگر ہے۔'' امام راغب نے سحر کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبھی کسی فعل کو اس کے حسن کی وجہ سے سحر کہا جاتا ہے۔ جیسے [اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا] (صحيح البخاری، كتاب الطب، باب مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا، حديث: 5767) میں اور کبھی اس کے فعل کی دقت یعنی باریکی کے لحاظ سے ایک چیز کو سحر کہا جاتا ہے۔ جیسے غذا کو اس کی باریک اور لطیف تاثیر کی وجہ سے سحر کہہ دیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بھی یہی دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک طرف اس کا حسن اور دلکشی کہ طبائع سلیمہ مجبور ہو کر اس کی طرف کھینچی چلی جاتی ہیں اور ان کا اثر بھی بہت باریک اور لطیف ہوتا ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ کفار انبیاء علیہم السلام کو ساحر کہتے رہے اور اسی لیے یہودیوں نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کاموں کو سحر کہا۔

وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ (889)

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے کھانا نازل کرے (حضرت عیسیٰؑ نے) کہا، اللہ کا تقویٰ کرو اگر تم مومن ہو۔ (890)

باقی تمام امور پر مفصل بحث سورۃ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ یہاں ان کو اس غرض کے لیے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل مقصد تو روحانی مردوں کو زندہ کرنا، روحانی بیماروں کو شفا اور مستعد فطرتوں کو زمینی خیالات سے بلند کر کے روحانیات کی بلندیوں میں پرواز کرانا تھا مگر ان لوگوں نے روحانی امور کو بھی جسمانی خیال کیا اور پستی کی طرف جھک گئے۔

889- وحی کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 768] حواریوں کی طرف وحی کرنا صاف بتاتا ہے کہ **وحی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے** یہ خیال کہ حواری بھی نبی ہوں گے بدیہی البطلان ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ پھر آگے ان کا سوال کہ ہم پر مائدہ آئے تو ہم کو یقین آئے گا کہ تو ہم سے سچ بولتا ہے، صاف بتاتا ہے کہ وہ نبی نہ تھے۔ پس ان کی وحی انبیاء والی وحی نہ تھی اور باوجود اس وحی کے ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر یقین کامل نہیں ہوا۔

890- يَسْتَطِيْعُ۔ اِسْتِطَاعَةٌ طاقت رکھنے کو کہتے ہیں لیکن بعض اہل لغت نے يَسْتَطِيْعُ بمعنی يُطِيْعُ یا يُجِيْبُ بھی لکھا ہے، یعنی قبول کرے گا۔

مَآئِدَةً۔ مَيْدَ سے ہے جس کے معنی کھانا دینا بھی آتے ہیں۔ مَادَنِيْ۔ اَطْعَمَنِيْ (غ) اور مائدۃ اس خوان کو کہا جاتا ہے جس پر کھانا ہو اور کھانے کو بھی کہا جاتا ہے۔ (غ) اور یہاں مراد کھانا ہے نہ خوان جیسا کہ ﴿عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا﴾ بتاتا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ مائدہ سے یہاں مراد علم ہے اور علم کو مائدہ اس لحاظ سے کہا کہ وہ قلوب کی غذا ہے۔ (غ) مگر یہ خیال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خیالات کو مدنظر نہ رکھنے سے پیدا ہوا ہے۔

یہ آیت اس رکوع کے اصل مضمون کی طرف توجہ کو پھیرتی ہے۔ باوجودیکہ حواریوں کو الہام بھی ہوا کہ وہ رسول پر ایمان لائیں مگر اس زمانہ کے یہودیوں کی حالت ایسی پستی کی تھی کہ دنیوی آسائش کا خیال دل سے نہیں گیا اور حواری تھے بھی معمولی درجہ کے لوگ، ماہی گیر، محصول لینے والے اور ایسے لوگ عموماً بلند خیالات کے مالک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کھانے کی درخواست کرتے

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل اطمینان پائیں اور ہم جان لیں کہ ضرور تو نے ہم سے سچ کہا ہے اور اس پر گواہ ہو جائیں۔ (891)

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے اللہ! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے کھانا نازل کر وہ ہمارے لیے عید ہو۔ ہمارے پہلوں (کے لیے) اور ہمارے پچھلوں کے لیے اور تیری طرف سے نشان ہو اور ہم کو رزق دے اور تو ہی بہتر رزق دینے والا ہے۔ (892)

ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب لطیف ہے۔ دعویٰ تو مومن ہونے کا کرتے ہو اور نبی مومنوں کو تقویٰ کی راہوں پر چلانے آتا ہے نہ جسمانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے۔ پس تم بھی مومن ہو تو تقویٰ کی راہوں پر چلو جو میری بعثت کی غرض ہے۔

891- **حواریوں کی روحانی حالت:** ان الفاظ سے حواریوں کی اصل حالت کا اندازہ لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بار بار شکایت کرتے ہیں جیسا کہ اناجیل میں ہے کہ تم میں ایمان نہیں اور اگر تم میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوتا تو تم یوں کرتے اور ووں کرتے۔ اور کبھی پطرس جیسے مقرب حواری کو شیطان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تو یہ بلا وجہ نہ تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ خواہشات دنیا کا ان پر غلبہ ہے۔ اور گو روحانیت میں کچھ ترقی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی کھانے پینے کے جسمانی خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دونوں کی قوموں کی حالت کمزور نظر آتی ہے۔ ان کے بالمقابل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا روحانی کمال ایک آفتاب کی طرح روشن ہے۔ تعجب ہے کہ باوجود الہام کے ابھی تک ان کو یقین کامل نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سے جو کچھ کہتے ہیں سچ ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سچ مچ قبروں سے مردے نکال کر زندہ کر دیا کرتے تھے اور مٹی کی شکلیں بنا کر ان کو سچ مچ کے پرند بنا دیتے تھے۔ ان کے لیے بھی یہاں سبق ہے کہ اگر ایسے کھلے معجزات ہوئے ہوتے تو حواری حضرت مسیح علیہ السلام کو سچا جاننے کے لیے ایک مائدہ کے اترنے کے کیوں محتاج ہوتے؟ قبروں سے مردوں کا نکل آنا اور مٹی کی شکلوں کا پرند بن جانا تو مائدہ کے اترنے سے بہت زیادہ کھلے معجزے ہیں۔ جو لوگ یہ دیکھ چکے ہوں وہ مائدہ کے محتاج نہیں ہو سکتے۔ پس کم از کم قرآن کے نزدیک مردوں کے نکالنے وغیرہ معجزات سے ظاہری معنی ہرگز مراد نہیں۔

892- عِيْدٌ۔ عَوْدٌ سے ہے جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں۔ اور عِيْدٌ وہ ہے جو لوٹ کر آئے۔ اور خوشی کے دن کے ساتھ یہ لفظ مخصوص

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع 15 7 5

اللہ نے کہا میں اس کو تم پر اتارنے والا ہوں۔ پھر جو کوئی تم میں سے (اس کے) بعد ناشکری کرے تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ تمام جہان میں اور کسی کو ایسا عذاب نہیں دوں گا۔ (893)

ہو گیا ہے۔ اور شریعت میں یوم الفطر اور یوم النحر سے مخصوص ہے۔ (غ)

حضرت عیسیٰؑ کی دعائے مائدہ:

ایک مرتبہ نصیحت کر کے آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں اور اپنی قوم کی خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی خواہش ﴿اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [النساء: 153:4] ''اللہ کو ہمیں کھلا کھلا دکھا'' کی وجہ سے یہ دعا کرنا پڑی ﴿رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ [الاعراف: 143:7] ''میرے رب! مجھے (اپنا آپ) دکھا'' مگر بجائے مائدہ کے جو صرف حواریوں پر نازل ہوا آپ ایسے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں جو پہلوں اور پچھلوں کے لیے یکساں موجب سرور ہو۔ اس دعا کی قبولیت میں موجودہ حالات کچھ شک باقی نہیں رہنے دیتے۔ کھانے کے معاملہ میں عیسائیوں کے ہاں عید ہی عید ہے۔ پہلوں اور پچھلوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ان کو روٹی کے ساتھ کچھ فکر آخرت کی بھی تھی۔ اب روٹی اور پیٹ کی پوجا ہی باقی رہ گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ کو امت کی روحانیت کا فکر:

مگر کیا یہ حالت رشک کے قابل ہے؟ ہمارے نبی کریم ﷺ نے جو دعا اپنی امت کے برگزیدہ لوگوں کے لیے کی ہے وہ یہ ہے کہ اے خدا آل محمد کا رزق کفاف ہو۔ یعنی اس قدر دنیا کے سامان میں انہماک نہ ہو کہ وہ آخرت کو بھول جائیں۔ یہ دنیا کا حقیقی روحانی معلم ہے جس کو اپنی امت کی روح کی فکر ہے۔ اس چیز کی فکر ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ مگر حضرت مسیح پر کچھ الزام نہیں۔ جس قسم کا قوم کا میلان دیکھا اسی قسم کی دعا کی اور وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ ابھی روحانیت کو ضروری کمال دنیا میں حاصل نہ ہوا تھا۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قوم کی حالت کے مطابق ہی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات میں بھی کھانے پینے کا بہت ذکر ہے۔ کہیں تھوڑی سی روٹیاں بہت لوگوں کو کفایت کرتی ہیں۔ [یوحنا: 6:1-14] تو کہیں اٹھارہ من پانی کی شراب بن جاتی ہے اور لوگ پی پی کر بدمست ہوتے ہیں۔ [یوحنا: 2:1-11] اور اسی معجزہ کا اثر آج یورپ میں نمایاں ہے۔ دعا کرتے ہیں تو وہاں بھی روز کی روٹی کی دعا ہی سب پر مقدم کرتے ہیں۔ ''ہماری روزینہ کی روٹی آج ہم کو بخش۔'' [متی: 6:11] سو عیسائیوں کو روٹی بھی مل گئی اور شراب بھی۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا میں نیکی اور اخلاق کا معلم بنے۔ روٹیاں بھی خدا دے دیتا ہے مگر سچ یہی ہے کہ انسانیت کا نصب العین کھانا پینا نہیں بلکہ نیکی اور اخلاق ہیں۔ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ [112]

893- یعنی دنیوی نعمتیں دی جائیں گی۔ لیکن ان کی ناشکری کا نتیجہ بھی پھر ویسا ہی برا ہوگا۔ عیسائی قوموں کے پاس دنیا کی دولت اور دنیا

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا (کہ) مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنالو۔[894] (عیسیٰؑ نے) کہا تو پاک ہے مجھے کہاں شایاں تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔[895]

کی آسائشیں بہت جمع ہوگئی ہیں اور دنیا کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ حد درجہ کی آسائش کے بعد مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔

894- **حضرت عیسیٰؑ سے عالم برزخ میں سوال:** یہ کلام عالم برزخ کا ہے جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں اسی کی تفسیر میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن نبی کریم ﷺ اپنی امت کے بعض لوگوں کو دوزخ کی طرف جاتے دیکھیں گے۔ آگے لفظ ہیں [فَأَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ] (صحيح البخاری، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى (وَاتَّخَذَ اللهُ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيلًا)، حديث: 3349) ''میں کہوں گا' جیسے عبد صالح یعنی عیسیٰ نے کہا۔'' جہاں اپنے لیے صیغہ مضارع اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے صیغہ ماضی استعمال کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔

مریمؑ کی اُلوہیت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خدا بنانا تو ظاہر ہے۔ مریم علیہا السلام کو بھی عیسائیوں کے بعض فرقوں نے صفات الوہیت دی ہیں۔ چنانچہ رومن کیتھولک اس کے بت بنا کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ ''خدا کی ماں'' اس کا خطاب ہی بتاتا ہے کہ اس کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے۔ اور انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا میں ہے کہ تھریس، عرب وغیرہ مقامات میں بعض عورتیں مریم کو خدا کی طرح پوجتیں تھیں اور مریم سے دعاؤں کا مانگنا بھی جائز رکھا گیا ہے۔ گو قرآن شریف نے مریم کو کہیں تثلیث کا اقنوم ثالث کر کے بیان نہیں کیا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر باپ، بیٹے، روح القدس کی بجائے تثلیث کے تین اقنوم، ماں باپ اور بیٹا تجویز کیے جاتے تو بہت زیادہ موزوں تھا۔

895- پہلا جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ دیا ہے کہ میرے لیے یہ کہاں شایاں تھا کہ میں ایسا کہتا۔ مگر اس سے بھی پہلے کہا سُبْحٰنَكَ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات تمام عیوب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ کوئی خدا یا معبود یا بیٹا بنانا اس کی صفات میں نقص پیدا کرنا ہے۔ ﴿مَا فِیْ نَفْسِیْ﴾ سے مراد ایسی باتیں ہیں جو انسان مخفی رکھے۔ کیونکہ دل میں جو بات رکھی جائے وہ مخفی ہوتی ہے ظاہر نہیں ہوتی۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے۔[896] اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں تھا' پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تُو ہی ان پر نگہبان تھا۔ اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔[897]

اور اسی طرح ﴿مَا فِیْ نَفْسِكَ﴾ سے مراد وہ باتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ مخفی رکھے۔ ان کا علم بندہ کو نہیں ہوسکتا۔

896- یہ دوسرا جواب ہے کہ میں نے انہیں کیا کہا۔ وہ وہی تھا جو خدا نے حکم دیا یعنی یہ کہ ''اللہ کی عبادت کرو، جو میرا اور تمہارا رب ہے''۔ ''تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر۔'' [متی: 10:4]

897- **حضرت عیسیٰ کا اقرار توحید اور تعلیم:** یہ تیسرا جواب ہے کہ نہ صرف میں نے توحید کی تعلیم دی بلکہ جب تک ان میں تھا تو ان پر گواہ بھی تھا۔ یعنی دیکھتا رہا کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور میری عبادت نہیں کرتے۔ پس یوں تین طرح نفی کی:

1. اول یہ کہ یہ نبی کو شایاں نہ تھا کہ ایسی تعلیم دیتا۔
2. دوسرے یہ کہ اس کے خلاف خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دی۔
3. تیسری یہ کہ آپ کی زندگی میں وہ لوگ واقعی اس تعلیم پر قائم بھی رہے۔ ہاں ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری وفات کے بعد ان کی کیا حالت ہوگئی اس کو تو ہی جانتا ہے۔ مراد ظاہر ہے کہ غلط تعلیم میری وفات کے بعد ان میں پھیلی۔ جب تک میں ان میں تھا تب تک وہ صحیح تعلیم پر قائم تھے۔

یہ آیت حضرت مسیح کی وفات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہے کیونکہ اس میں عیسائیوں کا عقیدہ بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے بعد کا قرار دیا ہے اور چونکہ وہ عقیدہ نزول قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی نزول قرآن سے پہلے ہو چکی تھی۔ رہے لفظ تَوَفّٰی کے معنی سو اس پر بحث ہو چکی ہے۔ [دیکھو نمبر: 444]۔ علاوہ ازیں اس آیت کے جو تفسیر خود نبی کریم ﷺ سے مروی ہے وہ بھی اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے۔ حدیث بخاری میں ہے کہ جب قیامت کے دن میری امت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نہیں جانتا کہ تیرے بعد انہوں نے کیا کیا [فَأَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب ﴿كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ 4625) ''یعنی میں وہی بات کہوں گا جو عیسیٰ نے کہی تھی اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تُو ہی ان پر نگہبان تھا۔'' نبی کریم ﷺ کا

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو ان کی حفاظت کرے تو تُو ہی غالب حکمت والا ہے۔ (898)

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

اللہ نے کہا یہ وہ دن ہے کہ صادقوں کو ان کی سچائی نفع دے گی۔ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ انہی میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے یہ بڑی کامیابی ہے۔ (899)

انہی الفاظ کو استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بگڑی۔ اور اسی طرح آپ کی امت آپ کی وفات کے بعد بگڑے گی۔ اس قطعیۃ الدلالت آیت اور اس حدیث صریح کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا انکار کرنا نصوص صریح کو رد کرنا ہے اور تَوَفَّيْتَنِي کے معنی سوائے وفات کے کچھ اور کرنا لغت کے خلاف ہے۔ اور بخاری نے ابن عباس کے اثر مُتَوَفِّيْكَ مُمِيْتُكَ کو یہاں بیان کر کے بتا دیا ہے کہ تَوَفَّيْتَنِي کے معنی سوائے وفات دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

898- یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرک کی معافی کے لیے سفارش نہیں کرتے۔ بلکہ چونکہ یہ کلام عالم برزخ کا ہے جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا اس لیے ﴿تَغْفِرْ لَهُمْ﴾ سے مراد ان کی حفاظت کر دینا ہے اور وہ حفاظت بذریعہ رسول کے ہے جو صحیح پیغام پہنچا کر ان کو ان کی غلطی پر متنبہ کرتا ہے۔ اسی لیے آخری الفاظ [اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ] نہیں حالانکہ معافی کی سفارش ہوتی تو یہی ہونے چاہیے تھے بلکہ ﴿اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اس موقعہ پر بولے ہیں۔ جہاں ایک رسول کی بعثت کے لیے دعا کی ہے ﴿رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾﴾ [البقرة: 129:2] ''اے ہمارے رب! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول اٹھا جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک کرے، تو غالب حکمت والا ہے۔'' اور عزت یا غلبہ اور حکمت کی صفات کا ذکر ایسے ہی موقعہ پر موزوں ہے جہاں اصلاح کر دی جائے۔ یہی معنی سدی سے مروی ہیں [اَنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَتُخْرِجَهُمْ مِّنَ النَّصْرَانِيَّةِ وَتَهْدِيْهِمْ اِلَى الْاِسْلَامِ] (ج) یعنی ﴿تَغْفِرْ لَهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کو نصرانیت سے نکال کر اسلام کی ہدایت فرمائے۔

899- يَوْمُ سے مراد وہ یوم ہے جو اس حیات دنیا کے بعد شروع ہوتا ہے اور ﴿يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ﴾ کے معنی اسی طرح پر ہیں

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع 16 5 6

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو کچھ ان میں ہے اللہ کے لیے ہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (900)

جس طرح ﴿لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ﴾ [الأحزاب: 8:33] ''تا کہ وہ سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے۔'' میں یعنی کہ جس نے زبان سے سچائی کا اقرار کیا ہے اس کے فعل کی صدق کا سوال کرے۔ کیونکہ اعتراف حق کافی نہیں جب تک کہ اس پر افعال صادقہ کی مہر نہ ہو۔ (غ) صدق کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں، زبان سے سچ بولنا اور افعال سے سچ کر دکھانا۔ پس یہاں یہ بتایا ہے کہ اس زندگی کے بعد یا اس اخروی زندگی میں انسان کو نفع پہنچانے والی دو چیزیں ہیں، ایک سچائی کا مان لینا دوسرا اس پر عمل کرنا۔ تو وہ لوگ جنہوں نے سچائی کو قبول ہی نہ کیا وہ کیا نفع اٹھا سکتے ہیں۔

900- سورت کے آخری الفاظ میں اپنی وسعت سلطنت پر فخر کرنے والی قوم کو بتایا ہے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے۔ انسانوں کا تصرف عارضی ہے، حقیقی مالک ایک ہی ہے جو ہمیشہ رہے گا۔ ابن جریر میں ہے کہ مخاطب نصاریٰ ہیں۔

سورۃ الانعام

نام:

اس سورت کا نام اَلْاَنْعَامِ ہے جس کے معنی چار پائے ہیں اور اس میں 20 رکوع اور 165 آیات ہیں۔ سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی کا بیان کرنا ہے۔ اسی تعلق میں ان مشرکانہ رسوم کا ذکر آتا ہے جو چار پایوں کے متعلق عرب میں مروج تھیں۔ یعنی بعض قسم کے اونٹوں، بکریوں وغیرہ کی عزت واحترام جو شرک کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان کو سانڈھ کے طور پر چھوڑ دیتے تھے نہ ان پر کوئی سواری کرسکتا تھا نہ ان کو ذبح کیا جاسکتا تھا نہ ان پر چرنے کے متعلق کوئی حد بندی عائد ہوسکتی تھی۔ اسی طرح کی اور بھی رسوم تھیں۔ اسلام کی اصل غرض نہ صرف توحید کا وعظ تھا کہ چند بڑے بڑے عالی دماغ لوگ خوش ہوجائیں اور ان کے لیے ایک بلند خیالات کی دعوت کا سامان مل جائے بلکہ عوام الناس کی زندگی پر توحید کا عملی طور پر اثر ڈالنا اس کے مدنظر تھا۔ ان کے رسوم ورواج سے **شرک سے تعلق رکھنے والی ہر بات کی بیخ کنی کرنا اصل مقصود تھا۔** اس لیے توحید کو جس صورت میں بیان کیا اس کا نام ایسا تجویز کیا جس کا تعلق ہر فرد بشر کے گھر سے تھا اور ان رسوم سے تھا جو ہر گھر میں صدیوں سے گھر کی زندگی کا حصہ بنی ہوئی چلی آتی تھیں۔ یہ خیالی بات نہیں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ توحید قائم نہیں ہوسکتی جب تک کہ ان رسوم کی بیخ کنی نہ ہو جو شرک کے رنگ میں ہر گھر اور ہر انسان کی زندگی کا عملی طور پر جزو بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملک ہندوستان کو لے لو۔ یہاں بت پرستی اور انسان پرستی اور رنگا رنگ کی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ پرستشیں ایک طرف رکھو اور **گائے کی مشرکانہ عظمت** کو دوسری طرف رکھو۔ ایک شخص کے لیے ان تمام قسم کی پرستشوں کو دور کرنا آسان ہے مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو جس کا تعلق ہر ہندو کے گھر سے اور ہر ہندو کی عملی زندگی سے ہے کوئی شخص دور نہیں کرسکتا۔ سوائے اس کے جو توحید کامل کا زبردست معلم ہو۔ سوامی دیانند جی کے لیے یہ آسان امر تھا کہ ایک سطحی توحید کی تعلیم انہوں نے ہندوؤں کو دی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو بت پرستی سے چھڑایا مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو وہ دور نہ کرسکے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی توحید سے یہ قوم اسی طرح دور پڑی ہوئی ہے۔ قرآن کریم کا اور رسول اللہ ﷺ کا یہ کمال تھا کہ نہ صرف عملی طور پر خطرناک سے خطرناک بت پرستی کو دور کرکے توحید الٰہی کو قائم کیا بلکہ شرک کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا اور اپنی اصلاح کو مکمل نہ سمجھا جب تک مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی نہ کردی۔

خلاصہ مضمون:

سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی ہے اور اول سے آخر تک اسی ایک مضمون پر زور دیا ہے۔ ہاں ضمناً کہیں رسالت کا ذکر اس تعلق سے آتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہی یہ توحید قائم ہوئی تھی اور اسی ضمن میں مکذبین کی انجام کار ناکامی یا مومنین کی تدریجی اور آخری کامیابی کا ذکر بھی آگیا ہے، مگر اصل غرض کو نہیں چھوڑا۔

① پہلے رکوع میں شرک فی الذات کی تردید کی یعنی ان لوگوں کے شرک کی جو دو خالق تجویز کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کچھ ذکر

اس پیغام کا اور اس کی تکذیب کرنے والوں کا کیا جو توحید کو قائم کرنے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔

② دوسرے رکوع میں شرک فی العبادت کی تردید کی۔

③ تیسرے میں بتایا کہ شرک ایسی چیز ہے کہ مشرکوں پر بھی ایک وقت آئے گا کہ وہ خود شرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

④ چوتھے میں مکذبین کے انجام کا۔

⑤ پانچویں میں عذاب استیصال کا ذکر ہے۔

⑥ چھٹے میں توحید کے ماننے والوں پر انعام واحسان کا ذکر ہے۔

⑦,⑧ ساتویں اور آٹھویں میں محاسبہ اعمال اور اس کی غرض کو بیان کیا۔

⑨ نویں میں بتایا کہ اس مذہب توحید پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء بھی قائم تھے اور ان کی اپنی قوم سے بحث کا ذکر کیا۔

⑩ دسویں میں بتایا کہ سب انبیاء کا مذہب توحید ہی تھا۔

⑪ گیارہویں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا ذکر فرمایا۔

⑫ بارھویں میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر کر کے توحید پر دلیل دی ہے اور ساتھ ہی حق کی تدریجی کامیابی کا ذکر کیا۔

⑬ تیرھویں میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کیا اور اللہ تعالیٰ کا بی بی اور بیٹے سے پاک ہونا بیان کیا۔

⑭ چودھویں میں پھر مشرکین کی مخالفت۔

⑮ اور پندرھویں میں منصوبہ بازوں کے انجام کا ذکر کیا۔

⑯,⑰ سولہویں اور سترھویں میں شرک اور مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا۔

⑱ اٹھارھویں میں ممنوع غذاؤں اور مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر کیا۔

⑲ انیسویں میں توحید کے عملی پہلو کو بیان کیا کہ غرض صرف ایک اقرار نہیں صرف مشرکانہ رسوم کا ترک کر دینا نہیں بلکہ صحیح اصول زندگی پر عمل پیرا ہونا توحید کا اصل مقصد ہے۔مال وجان کی حفاظت کے اصول بتائے۔

⑳ اور بیسویں میں بتایا کہ توحید کامل کو علمی رنگ میں قرآن کریم نے پیش کیا ہے تو اس کا عملی نمونہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی بلند مقام پر پہنچنے کی ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے۔اور سورت کا خاتمہ اگر ایک طرف ابطال کفارہ پر کیا تو دوسری طرف آخری الفاظ میں یہ خوش خبری بھی سنائی کہ جب تم توحید کے ان صحیح اصول پر قائم ہو جاؤ تو ہم تمہیں زمین میں بادشاہ بھی بنا دیں گے کیونکہ مخلوق کا خیر خواہ گروہ ہی ان پر حکومت کا اہل ہے اور ساتھ ہی ڈرایا بھی کہ اگر تم نے ان اصول کو ترک کر دیا تو وہ بادشاہت تم سے لے بھی لی جائے گی۔

ترتیب قرآنی میں الانعام کا مقام:

یہ سورت نزول میں پہلی چار سورتوں سے بہت پہلے کی ہے اور مکی ہے۔ مگر ترتیب میں اس کو بعد میں رکھا ہے حالانکہ اس کا مضمون جو توحید ہے چاہتا تھا کہ اس کو ابتدا میں رکھا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ توحید کو قرآن کریم نے بنیاد ٹھہرایا ہے۔ اس لیے قرآن شریف کی ابتدا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ سے ہوتی ہے۔ پھر سورۃ بقرہ کی ابتدا بھی ایمان بالغیب سے ہوتی ہے۔ پھر سب سے پہلا حکم جو قرآن شریف میں ہے وہ بھی ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ [البقرة: 21:2] ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو'' اور ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ [البقرة: 22:2] ''پس تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ'' ہی ہے۔ پھر سورۃ آل عمران کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ مسئلہ توحید ایک علمی مسئلہ ہے اس لیے مسلمانوں کی تعلیم میں ابتدا ایک ایسی سورت سے کی جس میں ان کی فلاح و بہبود کے طریق ان کو سمجھائے یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران اسی مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور ساتھ ساتھ دونوں میں یہود اور نصاریٰ کے عقائد باطلہ کی بھی تردید کی ہے۔ پھر سورۃ النساء میں معاشرت کے اصول کو بیان کیا اور سورۃ مائدہ میں تمدن کے اور اس ساری عملی تعلیم کے بعد توحید کے مضمون کو بیان کیا تاکہ مسلمان سمجھ لیں کہ ان کی مقدم ضروریات کیا ہیں۔

مائدہ سے تعلق:

اور سورۃ مائدہ جس کے بعد یہ رکھی گئی ہے اس سے بھی اس کا خاص تعلق ہے کیونکہ اس سورت میں عقود کے ایفاء کی طرف توجہ دلائی تھی تو سب سے بڑا عقد اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننا ہے اس کا ذکر بالتفصیل بیان کیا۔ بلکہ سورہ مائدہ کے آخر کا تعلق بھی الانعام سے خصوصیت سے ہے کیونکہ اس سورت کے آخر میں عیسائی عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کی جو ایک عظیم الشان شرک تھا۔ تو اب شرک کے تمام دوسرے پہلوؤں کا ذکر کر کے توحید کے مضمون کو کمال تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ سورت توحید پر ہے اس میں عیسائی عقیدہ کا ذکر بالتفصیل نہیں کیا بلکہ نہایت مختصر الفاظ پر بس کی ہے۔ ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ [الأنعام: 101:6] ''اس کا بیٹا کس طرح ہوسکتا ہے اور اس کی کوئی جورو نہیں۔''

تاریخ نزول:

اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ سورت ساری کی ساری ایک رات میں مکہ میں نازل ہوئی۔ دیگر روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورت سب کی سب ایک ہی مرتبہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دو یا تین آیات کو جو بعض لوگوں نے مدنی کہا ہے تو یہ غلط فہمی ہے۔ یہود کا ذکر یا بعض تفصیلات شریعت کا مکہ میں نازل ہونا ایک مسلم امر ہے۔ غذاؤں کی حلت و حرمت کا حکم سورۂ نحل میں بھی موجود ہے۔ حالانکہ وہ بھی بالاتفاق مکی ہے۔ اور سورۂ انعام سورۃ النحل کے بعد کی ہے اس لیے کہ اس سورت میں سورۂ نحل کے حکم حلت و حرمت غذا کا حوالہ موجود ہے ﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا﴾ [الأنعام: 145:6] ''کہہ میں اس میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا۔'' قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے آخری سال میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ایک اتنی بڑی سورت کا یک مرتبہ نازل

ہونا اور اس کا آنحضرت ﷺ کو یاد رہ جانا قرآن کریم کے عظیم الشان اعجازوں میں سے ایک اعجاز ہے۔ بعض لوگوں کی قوت حافظہ بے شک بڑی زبردست ہوتی ہے، بعض اشعار کو ایک ہی دفعہ سن کر یاد کر لیتے ہیں، بعض قصص کو ایک ہی دفعہ سن کر دہرا سکتے ہیں۔ لیکن یہ سورت نہ تو اشعار میں سے ہے نہ اس میں کوئی قصص ہیں۔ یہ چیزیں حافظہ کے معاون ہو جاتی ہیں بلکہ اس میں توحید کا علمی اور بظاہر خشک مضمون ہے جس میں بظاہر کوئی ربط نہیں۔ پھر یہ کوئی قصہ اور کہانی نہیں کہ دو چار لفظ ادھر ادھر ہو جائیں تو مضائقہ نہیں یا شعر نہیں کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرے موزوں لفظ سے پُر ہو جائے تو حرج نہیں۔ اس کی ایک زیر زبر میں فرق نہیں ہو سکتا، ایک حرف کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر نزول کے ساتھ یہ لکھ بھی لی جاتی ہے اور اس لکھی ہوئی سے دوسرے لوگ اس کو یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتے۔ پھر آپ کے لیے ضروری ہے کہ اسے نمازوں میں پڑھیں۔ ان حالات کے اندر کس قدر سخت حفاظت ہر زیر و زبر کی، ہر حرف کی بکار ہے اور یہ سب حفاظت آپ اس حالت میں کرتے ہیں کہ ایک ہی دفعہ آپ نے 20 رکوع اور 165 آیات کی اتنی لمبی سورت کو فرشتے کے منہ سے سنا ہے۔ یہ وہ اعجاز تھا جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى﴾ [الأعلیٰ: 6:87] یعنی ہمارے پڑھانے کا نشان یہ ہے کہ تم اسے کبھی بھولو گے نہیں۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے اور اس کا پورا ہونا جس پر تاریخ شاہد ہے کتنا بڑا اعجاز ہے اور یہ جو اس آیت اور اگلی آیت میں آتا ہے ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ [الأعلیٰ: 6:87-7] ''ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے۔'' تو بعض لوگوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کچھ قرآن شریف بھول بھی جایا کرتے تھے نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ اس طرح تو آیت کا مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھر آیت کا یہ مطلب ہوا کہ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہیں بھولے گا مگر جو اللہ چاہے بھول جایا کرے گا۔ تو نہ بھولنا ایک بے معنی بات ہوئی۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں تو یہاں اِلَّا استثنائے منقطع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے وہ تو ہرگز نہیں بھولے گا مگر یہ اس لیے نہیں کہ تمہارا حافظہ اس قدر زبردست ہے کہ تم کبھی کوئی چیز بھولتے ہی نہیں بلکہ اور باتوں میں جو اللہ چاہے بھول بھی جاتے ہو لیکن جو بات وحی سے تم کو پہنچائی جاتی ہے وہ نہیں بھولتے اور یہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے پڑھانے میں اعجاز ہے کہ ایک انسان جو اور باتیں بھول بھی جاتا ہے وحی الٰہی کا ایک لفظ تک نہیں بھولتا۔ اور پھر اس اعجاز کا کمال اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف اتنی اتنی لمبی سورتیں یک مرتبہ نازل ہوتی ہیں تو دوسری طرف کسی سورت کی کوئی آیت کسی وقت نازل ہوتی ہے اور ان ٹکڑوں کو آپ اسی طرح لکھوا دیتے ہیں اور ساتھ ہی حافظوں کو اس ترتیب سے یاد کرا دیتے ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ آپ کے پڑھنے میں نہ کبھی کسی لفظ میں کمی بیشی ہوتی ہے اور نہ ترتیب وحی میں ہی تغیر واقع ہوتا ہے۔ حالانکہ اس ترتیب سے لکھا ہوا قرآن بھی کوئی موجود نہیں۔ یہ بات بجائے خود نبی کریم ﷺ کا اتنا بڑا معجزہ ہے کہ جس کی نظیر دوسرے انبیاء علیہم السلام میں کوئی نہیں ملتی۔

اٰیَاتُهَا 165 (6) سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ (55) رُكُوْعَاتُهَا 20

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ①

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائے۔ پھر بھی جو کافر ہیں اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھہراتے ہیں۔ (901)

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ②

وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک میعاد ٹھہرادی اور ایک (اور) میعاد اس کے ہاں معین ہے پھر بھی تم جھگڑتے ہو۔ (902)

901- یَعْدِلُوْنَ۔ عَدَلَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 796] اور ﴿بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ﴾ میں مراد ہے کہ اس کا عَدِیْلٌ یعنی برابر یا شریک دوسرے کو ٹھہراتے ہیں اور [عَدَلَ عَنِ الْحَقِّ] کے معنی آتے ہیں جَارَ یعنی ظلم کیا۔ (غ)

اس سورت کی اصل غرض توحید الٰہی کو بیان کرنا ہے۔ اس لیے پہلی آیت میں ہی سب سے موٹی قسم کے شرک یعنی شرک فی الذات کی تردید کی ہے اور وہ شرک ثنویہ کا ہے یعنی جو لوگ دو خدا مانتے ہیں۔ ایک خالق خیر اور ایک خالق شر یا ایک نور کا بنانے والا اور ایک ظلمت کا۔ یہ عقیدہ آتش پرستوں میں پایا جاتا ہے اسلام نے **شر یا بدی کا کوئی مستقل وجود نہیں مانا** بلکہ بدی چونکہ محض ان قویٰ کے غلط استعمال کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں اس لیے خالق ایک ہی ہے یہی وجہ ہے کہ آسمان اور زمین کے ساتھ خلق کا لفظ لگایا اور ظلمت اور نور کے ساتھ جعل کیونکہ جو چیزیں اچھے استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہیں انہی کے برے استعمال کا نام بدی ہے۔ ہاں جَعَلَ کا فاعل **اللہ** ہے کیونکہ مسبب الاسباب وہی ہے۔ **شر کا خالق** الگ ماننے میں یہ تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ شر یعنی بدی کا مقابلہ کر کے انسان اس پر غالب نہیں آسکتا۔ بلکہ ضرور ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لیے ملوث رہے۔ برخلاف اس کے اسلامی توحید کی رو سے بدی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انسان غالب نہ آسکے۔ بلکہ انسان کی ساری جدوجہد کی اصل غرض یہی ہے اور یہی اس کا نصب العین ہونا چاہیے کہ بدی پر غالب آئے۔ اور ان لوگوں کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے گئے ہیں جو بدی پر غالب آئے اور جنہوں نے شیطان کو بھی اپنا فرمانبردار بنالیا۔

902- معلوم ہوا کہ ہر انسان مٹی سے ہی پیدا ہوتا ہے اس لے کہ غذائیں جن سے انسان کا قیام ہے وہ مٹی سے ہیں گویا مٹی کا خلاصہ

وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝۳

اور آسمانوں اور زمین میں وہی اللہ ہے وہ تمہاری چھپی اور ظاہر (باتیں) جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو تم کماتے ہو۔ (903)

وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۝۴

اور کوئی پیغام اپنے رب کے پیغاموں میں سے ان کے پاس نہیں آتا مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں۔ (904)

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۵

سو انہوں نے حق کو جھٹلا دیا جب وہ ان کے پاس آیا سو ان کے پاس اس (کے وقوع) کی خبریں آ رہیں گی جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔ (905)

غذائیں ہیں اور غذاؤں کا خلاصہ وہ نطفہ جس سے انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ جب آسمان اور زمین کی پیدائش کا ذکر کیا تو انسان کی پیدائش کا بھی ذکر کیا۔ ایک میعاد ٹھہرانے میں انسان کی زمینی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک وقت کے لیے ہے یعنی موت تک اور ﴿اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ جو اس کے حضور ہے وہ دوسری زندگی کے متعلق ہے یعنی اس کا کھلا ظہور بھی ایک وقت مقرر کے بعد ہوگا یعنی قیامت کے دن۔ اس لیے اسے مسمی یا معین کہا ہے۔ یوں مضمون کا انتقال توحید سے بعث بعد الموت کی طرف کیا گیا ہے۔

903- پہلی دو آیتوں میں یہ ذکر کر کے کہ خالق ایک ہی ہے اب فرمایا ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں وہی ایک ہی اللہ ہے یعنی دوسرا کوئی اس کی ذات میں شریک نہیں اور اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ **اللہ جو ذات باری کا اسم ذات ہے** اس میں ویسے بھی کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا۔ یعنی یہ نام کبھی کسی دوسرے معبود پر نہیں بولا گیا۔ حالانکہ اور ناموں میں لوگوں نے اشتراک کر لیا ہے اور پھر اس کی قدرت کا ذکر کر کے جو خلق میں نمودار ہوئی جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا اس کے علم کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی چھپی اور ظاہر باتوں میں اور کمانے میں یہ اشارہ ہے کہ تمہارے اعمال سے ہی دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے۔

904- اس راز کو کہ اعمال سے دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی وحی نے ہی انسان پر ظاہر کیا اور حالانکہ یہ بات انسان کی بھلائی کے لیے بتائی تھی مگر لوگ ہمیشہ ہی ایسے پیغام کو سن کر منہ پھیر لیتے رہے ہیں۔

905- جس سے وہ استہزاء کرتے تھے، وہ عذاب تھا جس سے ان کو ڈرایا جاتا تھا۔ اس کی خبریں آنے سے مراد خود اس عذاب کا آنا ہے۔ دوسری جگہ ہے: ﴿وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ﴾ [صٓ: 88:38] ''اور تم ضرور اس کی خبر کو ایک وقت کے بعد جان لو

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶

کیاانہوں نے غور نہیں کیا کہ کس قدر ان سے پہلے ہم نے نسلیں ہلاک کر دیں۔ جن کو ہم نے زمین میں وہ طاقت دی تھی جو طاقت تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر زور سے مینہ برساتا ہوا بادل بھیجا اور نہریں بنا دیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں۔ پھر ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ اور ان کے پیچھے دوسری نسل پیدا کر دی۔ (906)

وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷

اور اگر ہم تجھ پر کاغذ پر (لکھی ہوئی) کتاب اتارتے پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو جو کافر ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ صرف کھلا جادو ہے۔ (907)

گے۔'' یہاں بھی مراد وقوع ہی ہے۔

906- قَرْنٍ۔ قَرْنٍ یا اِقْتِرَانٍ کے معنی ہیں دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع کسی رنگ میں۔ اس لیے قَرْنٌ (جمع قُرُوْنٌ) وہ لوگ ہیں جو ایک زمانہ میں جمع ہوں یعنی ایک نسل۔ (غ)

﴿مَكَّنّٰهُمْ۔ نُمَكِّنْ لَّكُمْ﴾۔ صلہ لام کے ساتھ اور بغیر صلہ کے دونوں طرح آتا ہے اور اس کا اصل مَكَانَ (یا مَكَّنَ) سے ہے اور مَكَّنَهٗ کے معنی ہیں اس کو مکان یعنی ثبات اور قرار دیا یا مضبوطی اور قوت دی اور مَكَّنَ لَهٗ کے معنی بھی یہی کیے گئے ہیں اور یہ بھی کہ ان کو اسباب تصرف اور نعمتیں وغیرہ دیں۔ جیسے: ﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ﴾ [یوسف: 21:12] ''اس طرح ہم نے یوسف کو جگہ دی۔''

مِّدْرَارًا اس کا اصل دَرّ ہے جو دودھ یا آنسوؤں کے کثرت سے بہنے پر بولا جاتا ہے اور مطلق دودھ کو بھی کہتے ہیں۔ (ل) اور استعارۃً بارش کی کثرت پر بولا جاتا ہے اور دَرَّ اچھے یا برے عمل کو بھی کہا جاتا ہے جس سے [لِلّٰهِ دَرُّكَ] عام محاورہ ہے جو مدح اور ذم دونوں موقعوں پر بولا جاتا ہے۔ پہلی نسلوں کی ہلاکت کا ذکر ان کی عبرت کے لیے کیا ہے جن لوگوں کو دنیوی آسائشوں کا حصہ زیادہ مل جاتا ہے وہ آخرت کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسری قوم ان کی جگہ کھڑی ہو جاتی ہے۔

907- روحانیت سے بے بہرہ لوگ امور روحانی کو بھی جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے چاہتے ہیں کہ کتاب لکھی لکھائی اوپر

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸

اور کہتے ہیں اس پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا پھر ان کو ڈھیل نہ دی جائے گی۔ (908)

وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹

اور اگر ہم اسے فرشتہ بناتے تو ہم اس کو ضرور انسان بناتے اور ان پر وہی اشتباہ ڈالتے جو اشتباہ وہ اب ڈال رہے ہیں۔ (909)

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ ع 1 10 7

اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں کے ساتھ ہنسی کی گئی۔ سو جو لوگ اُن میں سے ہنسی کرتے تھے ان کو اسی نے آ گھیرا جس کے ساتھ وہ ہنسی کرتے تھے۔ (910)

سے آئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اس لیے اس کا کلام قلب پر نازل ہوتا ہے اگر لکھا لکھایا کلام اوپر سے نازل ہوتا تو قلب انسانی سے اس کا کچھ تعلق نہ ہوتا اور نہ دلوں کے اندر اس سے انقلاب پیدا ہوتا اور جو اصل غرض اس کلام کے آنے کی تھی وہی مفقود ہو جاتی اور یہ جو فرمایا کہ اگر ہم اس طرح بھی اتاریں تو اسے سحر کہیں گے۔ تو یہ صرف فرض کر لینے کے طور پر نہیں بلکہ آخر کار اسی قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ﴿كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ﴾ بھی بنا دیا مگر پھر بھی نہ مانا۔

908- یہ دوسرا اعتراض بھی روحانیت سے بے بہرہ لوگوں کا ہے۔ وہ جس طرح کلام الٰہی کو جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اسی طرح فرشتوں کو بھی۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ فرشتے تو سزا دینے کے لیے ہوں گے۔ جب انسان نیکی کے محرک ملائکہ کی بات کو قبول نہیں کرتا تو پھر لازماً دوسری قسم کے ملائکہ یعنی سزا دینے والے اس کے لیے آتے ہیں۔

909- يَلْبِسُوْنَ۔ لَبْس کے معنی ڈھانکنا۔ جس سے لِبَاسٌ ہے لَبْسِ اَمْرٌ سے مراد اس کا مشتبہ کر دینا ہے۔ (غ)

کبھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بشر کیوں رسول ہوا؟ فرشتہ کو خدا رسول بنا کر بھیجتا تا یقین آ جاتا۔ جواب دیا ہے کہ فرشتہ بھی انسانوں کی طرف رسول بن کر آتا تو انسان کی صورت میں ہی آتا۔ کیونکہ رسول کا تو بڑا کام یہ ہے کہ نمونہ بن کر دکھائے اور انسان کے لیے انسان ہی نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں فرشتہ تو غیر مرئی ہستی ہے جب تک وہ تجسم اختیار نہ کرے انسان اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اور جب ملک مجسم ہو کر آتا تو پھر اعتراض ویسے کا ویسا ہی رہتا۔

910- حَاقَ کے معنی زجاج نے احاطہ کیے ہیں یعنی گھیر لیا۔ اور بعض نے اس کے معنی لیے ہیں [عَادَ عَلَيْهِ وَبَالُ أَمْرِهٖ] اس کے ا

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑪

کہہ زمین میں پھرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑫

کہہ کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟ کہہ اللہ کا۔ اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے وہ تم کو ضرور قیامت کے دن کے لیے جمع کردے گا اس میں کوئی شک نہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا وہ ایمان نہیں لاتے۔ (911)

مرکاوَبَال اس پر لوٹ کر آیا۔ راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا اصل حَقٌّ ہے۔

جب رسول بدی کے بدنتائج سے ڈراتا ہے تو بدکردار لوگ طاقت کے نشہ میں اس پر ہنسی کرتے ہیں مگر وہ بدنتائج آخر کار آ گھیرتے ہیں۔

911- اس رکوع میں یہ بتایا کہ عبادت اور اطاعت صرف اللہ کے لیے ہی ہے کیونکہ وہی سب کا مالک ہے اور سب پر رحم کرتا ہے۔

اللہ کی رحمت کی وسعت:

﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت بے پایاں کا ذکر کیا ہے اور دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾[الأعراف: 156:7] ''اور میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔'' اور حدیث میں ہے [إِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ] (صحيح بخاری، كتاب التوحيد، باب وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، حديث:7422) میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی اور یوں اپنے بندوں کو تسلی دی ہے اور عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید کی ہے کہ خدا میں عدل ہے رحم نہیں۔ بتایا ہے کہ رحم تو اس قدر غالب ہے کہ اس کو اس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ اس کا رحم بے پایاں جس طرح جسمانی دنیا میں کام کر رہا ہے اسی طرح عالم روحانی میں کام کرتا ہے اور یہ جو اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں قیامت کے دن کے لیے جمع کرے گا تو اس میں گویا اسی رحمت کی وسعت کا ہی ذکر ہے کیونکہ اس رحمت کا عظیم الشان ظہور اسی عالم میں ہوگا اور جنہوں نے اچھے کام کیے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے مالا مال کرے گا بلکہ بتادیا کہ سب پر ہی رحمت ہوگی۔ ہاں جنہوں نے خدا کی رحمت کے سامانوں سے اس دنیا میں فائدہ نہیں اٹھایا وہ کچھ نقصان بھی اٹھائیں گے مگر آخر کار ان پر بھی رحمت ہوگی۔ رحمت کے غضب پر سبقت لے جانے کے کچھ معنی نہیں اگر یہ مانا جائے کہ کوئی حصہ بلکہ کثیر حصہ اور بڑا حصہ مخلوق کا ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہے گا اور عذاب جہنم سے کبھی بھی نجات نہ پائے گا۔

وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں بستا ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔(912)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

کہہ کیا میں اللہ کے سوا دوست بناؤں جو آسمانوں اور زمین کی ابتدا کرنے والا ہے۔(913) اور وہ کھانے کو دیتا ہے اور اسے کھانے کو نہیں دیا جاتا۔ کہہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں (ان میں) سب سے پہلا بنوں جو فرمانبردار ہوئے اور تو ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو۔(913ل)

قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

کہہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔(914)

912- سَكُوْن کے مقابل پر تَحَرُّك ہے۔ یعنی حرکت کرنا اور رات کے مقابل پر دن۔ اور سکون کے لیے رات ہی زیادہ موزوں ہے اور مقابل کے لفظ کا ذکر نہیں کیا۔ جیسا کہ اکثر اضداد میں سے ایک کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح مکان کے لحاظ سے سب کچھ اسی کا ہے اسی طرح زمانہ کے لحاظ سے بھی سب کچھ اسی کا ہے۔ اور عبادت اسی کی ہو سکتی ہے جو سب کا مالک ہے۔

913- فَاطِرِ۔ فَطَرَ کے معنی شَقَّ یعنی پھاڑنا ہیں۔ اور اس کی جمع فُطُوْرٌ ہے ﴿هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ﴾[الملك: 3:67] ''کیا تو کوئی بگاڑ دیکھتا ہے۔'' اور اللہ کے مخلوق کے فاطر ہونے کے معنی ہیں کہ وہ اس کی ابتدا اور اختراع کرنے والا اور اسی سے فِطْرَةٌ ہے۔ (ل) اور فَاطِرِ کا لفظ اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوئی خواہ ان کی پہلی حالت کیسی بھی ہو۔ اور قرآن شریف میں ہی ہے: ﴿كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾[الأنبيآء: 30:21] ''دونوں بند تھے تو ہم نے انہیں کھولا۔'' یعنی وہ پہلے ایک غیر ممیز حالت میں تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سب اجرام الگ الگ کر دیئے۔ پس جو کچھ بھی پہلی حالت فرض کی جائے اس کا بنانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

913ل- یہاں سب معبودانِ باطل کا رد کیا ہے۔ رزق کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے نہ کوئی دوسرا معبود کیونکہ وہی خالق اسباب بھی ہے۔ اس لیے فرمانبرداری کا حقیقی مستحق وہی ہے نہ کوئی اور۔

914- آنحضرت ﷺ سے یہ لفظ کہلوانا کہ میں بھی اگر نافرمانی کروں تو عذاب سے ڈرتا ہوں۔ آپ کے پیروؤں کو سمجھانے کے لیے

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ⑯

جس سے وہ (عذاب) آج پھیر دیا جائے تو اس پر اس نے رحم کیا' اور یہ کھلی کامیابی ہے۔(915)

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ⑰

اور اگر اللہ تجھے کوئی ضرر پہنچائے تو سوائے اس کے کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(916)

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ⑱

اور وہ اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے۔(917)

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ۫ شَهِيْدٌۢ بَيْنِیْ وَ بَيْنَكُمْ ۫ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا

کہہ' کون سی چیز شہادت میں سب سے بڑی ہے۔ کہہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔(918) اور یہ قرآن

ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انہیں کس قدر خائف ہونا چاہیے اور کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کی نافرمانی کی جرأت ان کو نہیں کرنی چاہیے۔

915- جس شخص سے عذاب اس دنیا کی زندگی میں ہی پھیر دیا جاتا ہے وہ خدا کی رحمت بے پایاں کے نیچے آ جاتا ہے۔ عذاب کا اس دنیا میں پھیر دینا یا دور کر دینا راہ راست کی ہدایت دینا ہے۔ يَوْمَىِٕذٍ سے مراد قیامت کا دن بھی ہو سکتا ہے مگر پہلے معنی کو ترجیح ہے۔

916- كَاشِفٌ۔ كَشَفَ کے اصل معنی ظاہر کر دینا ہیں جیسے کپڑے کا منہ سے اٹھا دینا۔ اسی سے غم اور تکلیف کے اٹھا دینے پر بولا جاتا ہے۔(غ)

یعنی کوئی معبود باطل اس دکھ کو دور نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت ملتا ہے۔ بھلائی پہنچانے کے ذکر کے بعد اس کے دور کرنے کا نام نہیں لیا۔ بلکہ فرمایا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے کیونکہ اصل منشائے الٰہی تو اسے خیر پہنچانے کا ہی ہے۔

917- اَلْقَاهِرُ۔ قَهَرَ کے اصل معنی غلبہ اور دوسرے کو ذلیل کرنا ہیں۔ اور الگ الگ دونوں معنوں میں بھی اس کا استعمال ہے۔(غ) اسی سے اَلْقَاهِرُ اور اَلْقَهَّارُ اسمائے الٰہی میں سے ہیں جن میں مراد صرف غلبہ ہے اور ﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ [الضحیٰ: 9:93] ''سو یتیم پر سختی نہ کر'' میں اور ﴿وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴾ [الأعراف: 127:7] ''اور ہم ان کے اوپر غالب ہیں'' میں ذلیل کرنا مراد ہے۔

918- **اللہ کی شہادت اس کے فعل سے ادا ہوتی ہے۔** وہ اسباب دنیا میں پیدا کر دیئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا حق ہونا ظاہر کر دیا

اَلْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾

میری طرف وحی کیا گیا ہے تا کہ میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے جس کو وہ پہنچے۔[919] کیا تم گواہی دیتے ہو اللہ کے ساتھ اور معبود ہیں؟ کہہ، میں گواہی نہیں دیتا۔ کہہ، وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم شرک کرتے ہو۔[920]

وقف لازم بلاختلاف

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ جو اپنے آپ کو نقصان میں ڈالتے ہیں وہی ایمان نہیں لاتے۔[921]

وقف لازم

ع 2 10 8

اور یہی سب سے بڑی شہادت ہے جو فعل سے ظاہر ہو۔

919- **فطری روشنی اور اس پر مؤاخذہ:** یہاں قرآن کریم کے ذریعہ سے انذار کے لیے دو گروہوں کا ذکر کیا۔ ایک وہ جو اس کے براہ راست مخاطب ہیں اور دوسرے ﴿مَنْۢ بَلَغَ﴾ یعنی جن کو یہ پہنچے۔ ان الفاظ سے قرآن کریم کے انذار کا دامن سب قوموں اور تمام زمانوں پر قیامت تک پھیلا دیا ہے کیونکہ ﴿مَنْۢ بَلَغَ﴾ سے باہر کوئی نہیں رہ جاتا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن کو قرآن کریم کی تبلیغ نہ پہنچے وہ اس کو نہ ماننے کی وجہ سے مؤاخذہ کے نیچے نہیں بلکہ فطرت انسانی کے خلاف جو کام وہ کریں اس کی وجہ سے مؤاخذہ کے نیچے ہوں گے۔ گویا ایک تو انسان کی فطرت کی دھیمی روشنی ہے جو طرح طرح کے عوارض کے نیچے دب جاتی ہے اور ایک قرآن کریم کے آفتاب عالمتاب والی روشنی ہے۔ اس دوسری روشنی میں نہ چلنے کی وجہ سے گرفت انہی لوگوں پر ہوگی جن کو یہ روشنی پہنچ گئی، ورنہ فطری روشنی کے لحاظ سے ہر انسان مؤاخذہ کے نیچے ہے۔

920- اس میں اصل غرض کو کھول کر بیان کیا۔ وہ سب چیز کا مالک ہے، سب پر رحم کرنے والا ہے، سب کا خالق ہے۔ وہی سب پر غالب ہے۔ پس اس کے سوائے دوسرا معبود کسی کو نہ بناؤ۔ پھر یہی وحی الٰہی کی شہادت ہے اور یہی صحیح فطرت انسانی کی شہادت ہے۔

921- پہلا حصہ آیت کا وہی ہے جو [البقرة: 146:2] میں آچکا۔ وہ مدنی ہے اور یہ مکی۔ گویا جو کچھ مکہ میں فرمایا وہی مدینہ میں۔ حالانکہ اس وقت ابھی یہودیوں کی طرف سے مخالفت کا اظہار نہ ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ قریش نے یہودیوں سے دریافت کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی نسبت ان کا کیا خیال ہے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی باتوں کو جھٹلائے؟ ظالم کامیاب نہ ہوں گے۔(922)

وَ یَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَیْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے تب ہم ان کو جنہوں نے شرک کیا کہیں گے وہ تمہارے شریک کہاں ہیں جن کے لیے تم جھوٹے دعوے کرتے تھے؟(923)

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ﴿۲۳﴾

تب ان کا فتنہ نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔(924)

922- **اللہ پر افترا ان کا یہ تھا کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے**۔ اس سورت کے سولہویں رکوع میں نہایت صفائی سے ان کے شرک اور مشرکانہ رسوم کو بار بار ﴿اِفْتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ﴾ کہا ہے۔

923- شُرَكَآؤُكُمُ میں اضافت ادنیٰ بلابست ہے۔ مراد ان کے شریک نہیں بلکہ وہ ہیں جن کو وہ خدا کا شریک بناتے تھے۔

ایک اجتماع تو قیامت کے دن ہوگا۔ مگر نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری نے بھی ایک نمونہ قیامت صغریٰ کا دکھا دیا اور اسی دنیا میں بھی ان مخالفین پر وہ وقت آ گیا کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ وہ تمہارے خدائی کے شریک کہاں ہیں اور کیوں اب تمہاری مدد نہیں کرتے؟

924- فِتْنَتُهُمْ۔ فِتْنَةٌ سے مراد یہاں بعض مفسرین نے شرک لیا ہے۔ بعض نے جواب یا عذر اور ان کے عذر کو فتنہ اس لیے قرار دیا کہ وہ جھوٹ ہے۔ مگر فتنہ کے اصل معنی بلا یا عذاب یا دکھ ہیں۔ اس لیے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک تو یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کو توحید کی وجہ سے دکھ دیتے ہیں۔ لیکن وہ وقت بھی ان پر آئے گا کہ دکھ دینا تو ایک طرف رہا خود شرک سے اپنی بیزاری ظاہر کریں گے۔ اِلَّا اس صورت میں استثنائے منقطع ہوگا۔

شرک نہ کرنے کا عذر:

''ہم مشرک نہ تھے'' یا تو جھوٹا عذر ہے اور اگلی آیت میں یہ اشارہ ہے۔ اور یا اشارہ ان کے اس خیال کی طرف ہے ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی﴾ [الزمر: 3:39] یعنی ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ اس صورت میں اگلی آیت میں یہ فرمایا کہ جس بات کا اقرار ان کی فطرتیں کرتی ہیں جیسا کہ قیامت کے دن

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

دیکھ کس طرح اپنے اوپر جھوٹ بولتے ہیں اور جو وہ افترا کرتے تھے ان سے جاتا رہے گا۔ (925)

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان میں سے وہ ہیں جو تیری طرف کان دھرتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ اسے سمجھیں نہیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (ہے)۔ اور اگر یہ سارے نشان بھی دیکھ لیں تو ان پر ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ جب تیرے پاس آتے ہیں تجھ سے جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔ (926)

وہ بول اٹھیں گے، اس کے آج خلاف کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ بھی جہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا نقشہ کھینچا ہے یہی دکھایا ہے کہ جب دکھ اور مصیبتیں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تب صرف خدا کو پکارتے ہیں۔ یوں بار بار اس فطرت کی شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی گواہی انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔ مگر پھر وہ جھوٹ بولتا ہے یعنی اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف عمل کرتا ہے۔

925- اپنے آپ پر جھوٹ بولنے میں ان کے اس دنیا میں عمل کی طرف اشارہ ہے کہ فطرت کی شہادت کچھ ہے لیکن یہ اپنے ہی خلاف جھوٹ بول کر کبھی تقرب کا عذر کر کے اور کبھی کچھ کہہ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن انکار شرک کر کے اپنے ہی خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔

926- يَسْتَمِعُ۔ اِسْتِمَاعٌ کے معنی اِصْغَآءٌ ہیں۔ (غ) یعنی مائل ہونا اور مراد کانوں کا مائل کرنا ہے یعنی کان لگانا۔

يَفْقَهُوْهُ۔ فَقِهَ اس علم سے جو موجود ہو علم غائب کی طرف پہنچنا ہے۔ اس لیے یہ علم سے زیادہ خاص ہے ﴿لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ [النسآء: 78:4] ''بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔'' اور تَفَقُّهٌ کے معنی ہیں فقاہت کو طلب کیا اور اس سے مخصوص ہوا ﴿لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبة: 122:9] ''تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں۔'' اور فقہ احکام شریعت کا علم ہے۔ (غ)

وَقْرًا۔ وَقْرٌ کان کے بوجھ کو کہتے ہیں۔ گدھے اور خچر کے بوجھ کو بھی وَقْرٌ کہا جاتا ہے اور وَقَارٌ سکون اور علم کو کہتے ہیں۔ (غ)

اَسَاطِيْرُ۔ اُسْطُوْرَةٌ کی جمع ہے اور یہ سطر سے ہے جس کے معنی لکھنا ہیں ﴿نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ﴾ [القلم: 1:68] ''دوات (گواہ ہے) اور قلم اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔'' ﴿وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ﴾ [الطور: 2:52] ''اور لکھی ہوئی کتاب۔'' ﴿كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا﴾ [الأحزاب: 6:33] ''یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔'' اور اَسَاطِيْرُ کہنے سے مراد ہے کہ جھوٹ

وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۟ ۲۶

اور وہ اس سے روکتے ہیں اور خود بھی دور رہتے ہیں۔ اور وہ صرف اپنے آپ کو ہی ہلاک کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ (927)

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۟ ۲۷

اور اگر تو دیکھے جب آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے کہ اے کاش! ہم لوٹائے جائیں اور رب کی باتوں کو نہ جھٹلائیں اور مومنوں میں سے ہوں۔ (928)

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۟ ۲۸

بلکہ ان کے لیے ظاہر ہو گیا جو پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر لوٹائے جائیں تو پھر وہی کریں جس سے روکے گئے تھے اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ (929)

بنا کر خود لکھ لیا ہے۔

اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ ابتدا کے طور پر مہر نہیں لگاتا یا پردے نہیں ڈالتا مفصل لکھا جا چکا ہے [دیکھو نمبر: 18] ایسے الفاظ میں عموماً اس کفر پر اصرار کی حالت کو قرآن کریم بیان کرتا ہے جو کفار خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے پیدا کر لیتے ہیں اور خود اس آیت اور اس سے اگلی آیت کے الفاظ سے یہی ظاہر ہے کیونکہ یہاں اول فرمایا کہ سارے نشان صداقت بھی دیکھ لیں تو ایمان نہ لائیں گے۔ گویا وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کفر کو کبھی نہ چھوڑیں گے خواہ کتنا بھی بین ثبوت مل جائے۔ پھر فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو ٹھنڈے دل سے باتوں پر غور کرنے کی بجائے جھگڑنے کے لیے آتے ہیں اور اس سے اگلی آیت میں ہے کہ نہ صرف وہ خود حق سے دور جاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے **دلوں پر پردوں کا ڈالا جانا عین قوانین الٰہیہ کے مطابق ہے۔**

927- یَنْـَٔوْنَ۔ نَاٰیَ کے معنی اَعْرَضَ یعنی منہ پھیر لیا یا تَبَاعَدَ یعنی دور ہو گیا ﴿وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ﴾ [بنی إسرائیل: 17:83] ''تو وہ منہ پھیر لیتا ہے۔'' (غ)

928- وُقِفُوْا۔ وَقَفَ کے معنی ٹھہرانا یا کھڑا کرنا ہیں۔ اسی سے موقف ٹھہرنے کی جگہ ہے اسی سے وقف کرنا ہے۔

آگ کے سامنے لا کر کھڑا کر دینے سے مراد ہے کہ یقینی طور پر ان کو عذاب آنے کا مشاہدہ ہو جائے گا اور دوزخ سامنے ہوگا۔

929- **افعال بد کے بدنتائج اور ان کا اخفا اور ظہور:** پہلی آیت میں بتایا کہ آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو پھر دوبارہ دنیا

وَ قَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہتے ہیں سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں اور ہم نہیں اٹھائے جائیں گے۔(930)

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع 3 10 9

اور اگر تو دیکھے جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ وہ کہے گا کیا یہ سچ نہیں؟ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم۔ کہے گا تو عذاب چکھو اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَ هُمْ

وہ لوگ ضرور گھاٹے میں رہے، جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا یہاں تک کہ جب (مقررہ) گھڑی ان پر یکا یک آ جائے گی کہیں گے اے ہم پر افسوس! اس پر جو ہم نے

میں جانے کی خواہش ظاہر کریں گے اور کہیں گے کہ اب ہم خدا کی باتوں کو نہ جھٹلائیں گے۔ یہاں جواب دیا ہے کہ ایسا کہنے میں وہ جھوٹے ہیں اور اس کی وجہ یہ دی ہے کہ کوئی نئی بات تو ہوئی نہیں ﴿بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا یُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ﴾ جو پہلے چھپاتے تھے وہ ظاہر ہو گیا۔ یعنی ان کے افعال بد کے بدنتائج۔ اگر یہ چاہتے تو ان نتائج کو پہلے بھی دیکھ سکتے تھے کیونکہ سچ یہی ہے کہ برے فعل کے بدنتیجہ کو انسان دیکھ سکتا ہے مگر خود ہی اس کی طرف سے آنکھیں بند کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نتیجہ ایک خطرناک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قیامت کے دن ہوگا یا جیسا کہ بعض وقت اس دنیا میں بھی ہوتا ہے، جب بدی اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر عالم دنیا میں دوبارہ جائیں تو پھر وہی کام کریں گے۔ کیونکہ ان کے بدافعال کے نتائج تو پھر اسی رنگ میں ہوں گے جیسے اب ہیں اور ان کے اندر اخفا کا رنگ ہوگا وہ کھلا رنگ نہ ہوگا جس کا ظہور قیامت میں ہوتا ہے اس لیے وہ ان کاموں سے رکیں گے بھی نہیں۔ اس دنیا میں بھی انسان کی یہی حالت ہے کہ ایک فعل کے بدنتائج کو دیکھتا ہے مگر ذرا ان سے نجات ہوئی پھر اس بدفعل کا ارتکاب کرتا ہے۔

930- بدی کی اصل وجہ یہی ہے کہ انسان زندگی بعد الموت کا انکار کرتا ہے۔ ہر ایک بدفعل کا نتیجہ چونکہ اس دنیا میں نہیں ملتا اس لیے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بدفعل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ **آخرت پر یقین ہی انسان کے اندر اپنے افعال کی ذمہ داری کا پورا پورا احساس پیدا کرتا ہے** ﴿اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا﴾ کہنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی زندگی کی غرض کھانے پینے سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتے۔

يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

اس میں کمی کی۔ اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائیں گے۔ سنو وہ بوجھ برا ہے جو اٹھائیں گے۔ (931)

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور دنیا کی زندگی صرف کھیل اور بے حقیقت مشغلہ ہے اور آخرت کا گھر یقیناً ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ کرتے ہیں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ (932)

931- اَلسَّاعَةُ۔ سَاعَةٌ اصل میں زمانہ کے اجزا میں سے کسی جزو کا نام ہے اور اس سے مراد قیامت بھی لی جاتی ہے۔ اور سَاعَةٌ بمعنی قیامت تین طرح پر بولا جاتا ہے یعنی محاسبہ کے لیے لوگوں کا اٹھایا جانا یا ساعت کبریٰ ایک نسل کا ایک قوم کا فنا ہو جانا یا ساعت وسطیٰ۔ ایک انسان کی موت یا قیامت صغریٰ، جیسا کہ حدیث میں ہے: [مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ] (روح المعانی، جلد7، صفحہ132)۔ [دیکھو نمبر: 108]

بَغْتَةً۔ بَغْتٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا ناگہاں اس طرف سے آ جانا جہاں سے گمان نہ ہو۔ (غ)

فَرَّطْنَا۔ فَرَّطَ کے معنی ہیں قصد کر کے آگے بڑھا اور فَارِطٌ یا فَرَطٌ متقدم یعنی آگے جانے والے یا آگے بڑھنے والے کو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا [أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ] (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب فِي الْحَوْضِ: 6575) یا جیسے چھوٹے بچے کے جنازے کی دعا میں ہے [اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا] (صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلَى الْجَنَازَةِ.) اور اِفْرَاطٌ یہ ہے کہ آگے بڑھنے میں حد سے تجاوز کرے اور تَفْرِيْطٌ یہ کہ آگے بڑھنے میں کوتاہی کرے ﴿مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: 56:39] ''جو میں نے اللہ کی جانب نگاہ رکھنے میں کوتاہی کی۔'' ﴿مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ﴾ [یوسف: 80:12] ''جو یوسف کے معاملہ میں تم قصور کر چکے ہو۔''

اَوْزَارَ۔ وِزْرٌ کی جمع ہے جس کے معنی بوجھ ہیں اور مراد گناہ ہے اور وزر کے معنی جائے پناہ ہیں جو پہاڑ میں ملے۔ (غ)

اللہ کی ملاقات یا **لقاء اللہ کا مرتبہ** انسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ کمال کا مرتبہ ہے اور اس کا جھٹلانا گویا انسان کے کمال کی ترقیات کا جھٹلانا ہے۔ جتنی اعلیٰ غرض انسان اپنے سامنے رکھتا ہے اسی قدر اپنے خداداد قویٰ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے اور لقاء اللہ سے یا اخلاق اللہ میں رنگین ہونے سے بڑھ کر کوئی مقصد انسانی زندگی کا نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس مقصد کو چھوڑتا ہے وہ اپنی اغراض کو صرف دنیوی زندگی تک محدود کر لیتا ہے اور اپنے اعلیٰ قویٰ کو بیکار کر دیتا ہے اور جس بوجھ سے وہ بچنا چاہتا ہے یعنی خدا کے لیے جدوجہد اس سے بہت بڑھ کر بوجھ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔

932- لَهْوٌ وہ چیز ہے جو انسان کو اس بات سے جو اس کے لیے ضروری اور اہم ہے روک کر دوسری طرف مشغول کر دے۔ (غ)

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

ہم خوب جانتے ہیں کہ تجھے وہ بات غم دلاتی ہے جو وہ کہتے ہیں۔ پر وہ تجھے نہیں جھٹلاتے لیکن ظالم اللہ کی باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ (933)

لہو اور لعب میں فرق:

لَهْوٌ اور لَعِبٌ [دیکھو نمبر: 845] فرق یہ ہے کہ لَعِبٌ میں خوشی کو فوراً حاصل کرنے کا خیال ہوتا ہے اور لہو صرف اصل مقصد سے روکنے والی چیز ہے گو اس سے فوری خوشی مقصود نہ ہو۔

﴿اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ﴾ یا دنیا کی زندگی سے یہاں اور ایسے دوسرے موقعوں پر مراد وہ حصہ ہے جو لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد سے خالی ہے۔ جو صرف کھانے پینے اور سفلی خواہشات کے پورا کرنے تک محدود ہے۔ اسی لیے اس کا مقابلہ آخرت سے کیا ہے۔ پس وہ اعمال جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا مدنظر ہے گو وہ کھانے پینے سے بھی تعلق رکھتے ہوں ﴿اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ﴾ کا نہیں بلکہ دار الآخرۃ کا حصہ ہوں گے۔

یہاں یہ توجہ دلائی ہے کہ کھانا پینا اور خواہشات سفلی کا پورا کر لینا ان باتوں کا تو آخرت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو حیوانی زندگی کے ساتھ اشتراک ہے۔ پس جہاں تک آخرت کی تیاری کا سوال ہے، جہاں تک لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھنے کا سوال ہے، اس پر کھانے پینے وغیرہ سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ صرف ایک کھیل اور بے حقیقت بات ہے۔ کیونکہ لَهْوٌ وہ چیز ہے جو انسان کو اعلیٰ مقصد سے دور رکھتی ہے۔ اگر انسان خداداد عقل سے کام لے تو اسے سمجھ آ جائے کہ ایک اعلیٰ مقصد کو ترک کرنا اس کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے۔

933- يَجْحَدُوْنَ۔ جُحُوْدٌ یہ ہے کہ جس چیز کا دل میں اثبات ہے اس کی نفی کی جائے اور جس کی دل میں نفی ہے اس کا اثبات کیا جائے ﴿وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ﴾ [النمل: 14:27] ''اور انکار کیا، حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔'' (غ)

یہ آیت اس بات پر صریح دلالت کرتی ہے کہ **نبی کریم ﷺ کا صدق دشمنوں تک کو مسلم تھا۔** چنانچہ اس قسم کے واقعات جن میں ایسا اعتراف موجود ہے تاریخ میں موجود ہیں۔ حارث نے آپ سے کہا [مَا كَذَبْتَنَا قَطُّ] تو نے ہم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ابوجہل کے لفظ ہیں [اَنَّ مُحَمَّدٌ اَلصَّادِقُ وَمَا كَذَبَ قَطُّ] محمد ﷺ صادق ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور سب اہل عرب آپ کو اَلْاَمِيْنُ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہاں جب ان کے لقاء اللہ کی تکذیب کا ذکر کیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ یہ تجھے تو جھوٹا کہہ نہیں سکتے کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا نہ کبھی کسی نے آپ کی طرف جھوٹ منسوب کیا۔ ہاں یہ آیت اللہ کا انکار ہے کیونکہ آپ کی صداقت کا انکار نہیں بلکہ اس پیغام کا انکار ہے جو منجانب اللہ آپ کو دیا گیا۔

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور تجھ سے پہلے رسول یقیناً جھٹلائے گئے سو انہوں نے جھٹلایا جانے پر اور ایذا دیا جانے پر صبر کیا' یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچی اور اللہ کی باتوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں۔ اور تیرے پاس پیغمبروں کی کسی قدر خبر بلاشبہ آ چکی ہے۔ (934)

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

النصف

اور اگر تجھ پر ان کا منہ پھیر لینا دشوار گزرتا ہے تو تُو اگر طاقت رکھتا ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ تلاش کر لے یا آسمان میں کوئی سیڑھی۔ پس ان کو کوئی نشان لا دے۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کو ہدایت پر جمع کر دے' سو تو جاہلوں میں سے نہ ہو۔ (935)

934- ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ سیاق وسباق کی پروانہ کر کے پادریوں نے ان الفاظ سے وہ کام لیا ہے جو ڈوبتا ہوا تنکے سے لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی تکذیب پر آپ کو یہاں تسلی دیتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ پہلے رسول بھی جھٹلائے گئے یہاں تک کہ نصرت الٰہی آ پہنچی ایسا ہی تمہارے ساتھ ہوگا۔ اور ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ کا صاف مفہوم یہی ہے کہ اس پیشگوئی کو کوئی بدل نہیں سکتا، یعنی یہ پوری ہو کر رہے گی۔ اور آگے ﴿وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ﴾ موجود ہے یعنی جیسا پہلے رسولوں کے دشمنوں سے ہوا ایسا ہی تمہارے دشمنوں سے ہوگا۔ مگر پادری کہتے ہیں اس سے مراد ہے کہ کتب الٰہی میں کوئی تحریف نہیں کر سکتا۔ حالانکہ قرآن شریف نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر سابقہ کتب الہامی میں تحریف ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور آج واقعات اور علوم نے اس کی تائید کی ہے۔

935- سُلَّم اس کا مادہ بھی سِلْمٌ یا سلامتی ہے اور مراد اس سے وہ چیز لی جاتی ہے جس سے بلند مکان پر پہنچ سکیں اور اس سے سلامتی کی امید رکھی جائے یعنی سیڑھی۔ پھر اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے کسی بلند شے کو حاصل کر سکیں جیسے سبب۔ (غ) جیسے ﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ﴾ [الطور: 38:52] ''کیا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہے جس سے یہ سن لیتے ہیں۔''

یہاں خطاب ہر مخاطب کو ہے لیکن اگر رسول اللہ ﷺ کو بھی خطاب مانا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ نبی کریم ﷺ کو جو ان کے ایمان لانے کی بڑی تڑپ تھی تو اس لیے ان کا اعراض کرنا بڑا شاق گزرتا تھا اور آپ چاہتے تھے کہ زمین و آسمان سے کوئی ایسے نشان ظاہر ہوں کہ وہ ایمان لائیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نشانوں کا دکھانا پیغمبر کی طاقت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اس

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللہ اٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (936)

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور کہتے ہیں اس پر کوئی (بڑی) نشانی اس کے رب کی طرف سے کیوں نہ اتاری گئی؟ کہہ، اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ نشان اتارے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (937)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ

اور زمین میں کوئی جان دار نہیں اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ (938)

کے ذریعہ سے کوئی معجزہ دکھا دیتا ہے۔

اگر اللہ چاہے تو ان کو ہدایت پر جمع کر دے یہ پیشگوئی تھی جو پوری ہوئی اور اگر معنی یوں کیے جائیں کہ اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو مراد یہ ہے کہ ان کو پیدا ہی ایسا کرتا کہ ان کو نیک و بد کی تمیز نہ دی جاتی اور نہ وہ عقل سے کام لے سکتے۔ جاہل اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جس کو کسی خاص بات سے ناواقفیت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس پیشگوئی یا اس قانون سے بے خبر نہ رہو۔

936- **بعث سے مراد بعث روحانی:** مُردوں کا بعث ایک تو قیامت کے دن محاسبہ کے لیے ہوگا اور ایک بعث روحانی ہے جو نبی کریم ﷺ کے ذریعہ ظہور میں آنا تھا۔ کیونکہ یہ بھی ایک موت سے اٹھنا ہے [دیکھو نمبر: 79] یہاں یوم قیامت کا ذکر نہیں۔ اس لیے مراد اس سے بعث روحانی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو بالکل مردہ ہیں اور بات کو سنتے نہیں یہ بھی آخر اٹھیں گے گو ابھی صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [الحدید: 17:57] اللہ زمین کو موت کے بعد پھر زندہ کرے گا۔ زمین کی موت اس کے رہنے والوں کی روحانی موت ہے۔

937- یہاں آیت سے مراد عذاب استیصال ہے۔ اور آیت کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ جب ان کو یہ کہا گیا کہ تم مُردوں میں بھی اللہ تعالیٰ پیغمبر کے ذریعہ سے روح نفخ کرے گا تو بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے وہ اعدائے حق کی عادت مستمرہ کے مطابق ہلاکت مانگتے ہیں۔ چنانچہ اس رکوع کی آخری آیات میں صاف اس عذاب کا ذکر ہے۔ یہاں نشانات یا معجزات کے دینے سے انکار نہیں بلکہ یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے بتا دیا ہے کہ عذاب بھی آخر آ رہے گا۔

938- **دابۃ اور طیر کے انسانوں جیسی امت ہونے سے مراد:** چرند اور پرند سب تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ یہاں ذکر کفار کا ہے جن کی نظر دنیا سے آگے نہیں جو لقاء اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور اسی حیات دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جن کی نظر

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٨﴾

ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔(939)

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٩﴾

اور جنہوں نے ہماری باتوں کو جھٹلایا ہے بہرے اور گونگے اندھیرے میں ہیں۔ جس کو اللہ چاہے گمراہی میں رہنے دے اور جسے چاہے اسے سیدھے راہ پر رکھے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٠﴾

کہہ، بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر آ جائے یا (مقررہ) گھڑی تم کو آ لے کیا تم اللہ کے سوا (کسی اور کو) پکارو گے اگر تم سچے ہو؟

کھانے پینے اور خواہشات سفلی سے اوپر نہیں اٹھتی ان کو بتایا ہے کہ اس لحاظ سے تو تم میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ دوسری جگہ ایسے ہی لوگوں کا ذکر کر کے فرمایا ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ [الأعراف: 179:7] ''وہ چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ بہت زیادہ گمراہ۔'' دوسری توجیہ ان الفاظ کی یوں ہوسکتی ہے کہ سب انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ دوسرے جاندار بھی تمہاری طرح ہیں۔ جو فطرت ان کو خدا نے دی ہے وہ اس کے مطابق چلتے ہیں۔ مگر تم اپنی فطری نور کی شہادت کو رد کرتے ہو جیسا کہ فرمایا ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ [بنی إسرائیل: 44:17] ''اور کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔'' تیسری توجیہ یہ ہے کہ انسانوں کے دو گروہوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے ایک جو مثل چارپایوں کے زمین پر جھکے رہتے ہیں اور دوسرے جو طائر کی طرح عالم روحانیت میں پرواز کرتے ہیں یعنی کافر اور مومن۔

939- اَلْكِتٰبُ سے مراد یہاں قرآن شریف ہی ہے اس میں کوئی کمی نہیں رکھی یعنی خوب کھول کر سمجھایا ہے۔

﴿ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ﴾۔ حَشْرٌ کے اصل معنی اکٹھا کرنا ہیں۔ آیا یہاں حشر سے مراد قیامت کے دن جمع کرنا ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ **بہائم کا حشر ان کی موت ہے**۔ (ج) بعض نے کہا کہ قیامت کے دن کا حشر مراد ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بہائم میں بھی اللہ تعالیٰ عدل کرے گا لیکن اس طرح حیوانات کو بھی مکلف ماننا پڑتا ہے۔ پھر اس خیال کی کہ ان میں رسول مبعوث ہوتے ہیں کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس خیال کے رکھنے والوں کو ملاحدہ کہا ہے اور انسانی شریعت کے مکلف حیوانات کو ٹھہرانا خلاف قرآن ہے۔ کیونکہ اس میں عقل وفکر سے کام لینے کی تاکید کی ہے جو ان کو عطا نہیں ہوا۔ پس یا تو جو معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں وہی درست ہیں یعنی ان پر موت آ جاتی ہے اور یہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہے۔ مگر اس سے بھی بہتر توجیہ ان الفاظ کی یہ ہے کہ رَبِّهِمْ اور يُحْشَرُوْنَ میں ضمیر لوگوں کی

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع 4 11 10

بلکہ تم اسی کو پکارو گے سو جس کے لیے تم پکارو گے اگر چاہے تو اسے دور کر دے گا اور تم انہیں بھول جاؤ گے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ (940)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ

اور بلاشبہ ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف رسول بھیجے تب ہم نے ان کو تکلیف اور دکھ میں مبتلا کیا تا کہ وہ

طرف پھرتی ہے جن کا ذکر اوپر چلا آیا ہے نہ حیوانات کی طرف جن کا ذکر صرف بطور مثال ہوا ہے۔ بلکہ رَبِّهِمْ میں ضمیر جو ذوی العقول کے لیے ہے اس کی تائید کرتی ہے۔ پس مراد ہے کہ انسانوں کی مثال تو دوسری جاندار مخلوق کی طرح ہے جہاں تک اس سفلی زندگی کا سوال ہے جو خورد و نوش سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر ان میں ایک بات ان سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان کا حشر بھی اپنے رب کی طرف ہوگا۔ یعنی اعمال کی جزا و سزا کے لیے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اگلی آیت میں اس دوسری زندگی کی تکذیب کرنے والوں کو ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ﴾ [البقرة: 18:2] کہا ہے یعنی جس طرح چار پایہ نہ آواز کا مفہوم سمجھ سکتا ہے، نہ بول سکتا ہے۔ یہی حالت ان کی ہے ﴿بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ [البقرة: 171:2] ''جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔''

940- اَرَءَيْتَكُمْ (رَاٰی بمعنی علم یا جاننے سے) اَخْبِرْنِیْ کی جگہ پر ہے یعنی اس کے معنی ہیں مجھے بتاؤ اور اَرَاَيْتَ پر کاف داخل ہوتا ہے تو اَرَاَيْتُكَ۔ اَرَءَيْتَكُمْ وغیرہ اس کی صورتیں ہو جاتی ہیں اور اَرَاَيْتَ اور اَرَأَيْتُمْ اپنی اصل صورت پر قرآن کریم کی آیات میں جہاں جہاں آیا ہے صرف تنبیہ کے معنی میں آیا ہے۔ (غ)

یہاں عَذَابُ اللّٰهِ اور سَاعَةٌ کو الگ الگ کر کے بیان کیا ہے کیونکہ سَاعَةٌ سے مراد ان کی تباہی یا ان کی قوت و شوکت کے جاتے رہنے کی گھڑی ہے جو ان کی ساعت وسطیٰ ہے اور عذاب سے مراد اس سے چھوٹا عذاب ہے۔ عَذَابٌ یا سَاعَةٌ کے وقت ان کا اللہ تعالیٰ کو پکارنا اور اپنے شرکاء کو چھوڑ دینا ﴿تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ﴾ [الانعام: 41:6] ''تم انہیں بھول جاؤ گے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔'' واقعات میں سے ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ بھی فرمایا ﴿دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [یونس: 22:10] ''اللہ کو اسی کی خالص فرمانبرداری سے پکارتے ہوئے۔'' اور ﴿فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ﴾ [الانعام: 41:6] ''سو جس کے لیے تم پکارو گے اگر چاہے تو اسے دور کر دے گا۔'' میں بتایا کہ **جب اضطرار کی حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے** تو بعض تکالیف کو جنہیں چاہے اللہ تعالیٰ دور بھی کر دیتا ہے۔ اِنْ شَآءَ میں بتا دیا کہ بعض وقت اس کی مشیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جب عذاب استیصال آ جاتا ہے تو پھر وہ دور نہیں کیا جاتا۔ اسی کے متعلق فرمایا ﴿مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ﴾ [الرعد: 14:13] ''کافروں کی دعا ضائع ہی جاتی ہے۔'' اسی لیے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں بتایا کہ معمولی عذاب بھیجنے سے ہماری غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کریں۔

يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

عاجزی کریں۔ (941)

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

تو جب ان پر ہمارا عذاب آیا کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے اسے اُن کے لیے خوبصورت کر دکھایا جو وہ کرتے تھے۔ (942)

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

سو جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب اس پر بہت خوش ہو گئے جو انہیں دیا گیا تھا ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا تب وہ مایوس ہو گئے۔ (943)

941- يَتَضَرَّعُوْنَ۔ ضَرَعَ اور تَضَرَّعَ کے معنی ہیں عاجزی اور پستی کا اظہار کیا۔ (ل)

یہاں ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ دکھوں اور تکلیفوں کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض صرف یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور تکبر کو چھوڑ کر خدا کے حضور عاجزی کا اظہار کریں۔ پس دکھ اور تکلیف کے آنے سے انسان کو یہ فائدہ اٹھانا چاہیے کہ خدا کی طرف جھکے اور دنیوی زندگی کی ظاہری نمائشوں پر فریفتہ نہ رہے۔ یہ وہ دکھ اور تکلیفیں ہیں جو عذاب استیصال سے پہلے آتی ہیں۔

942- یہاں صفائی سے بتا دیا کہ انسان جو عمل بد کرتا ہے تو ان کو مزین کر کے دکھانے والا شیطان ہوتا ہے نہ خدا۔ یہ آیت ان آیات کے حل کرنے میں اصول محکم کے طور پر ہے جہاں تزئین کے فاعل کا ذکر نہ ہو اور جس فعل کا اچھا کر کے دکھایا گیا ہے وہ فعل بد ہو۔

943- جب تھوڑی مصیبت سے قوم فائدہ نہیں اٹھاتی تو پھر بڑی مصیبت کا آنا لازمی امر ہے۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی تکلیف جب دور ہو جاتی ہے تو پھر ہر قسم کے آسائش کے سامان میسر آ جاتے ہیں اور لوگ اس پر خوش ہو کر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ ایک معمولی بات تھی ﴿قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ﴾ [الأعراف: 95:7] ''کہنے لگے ہمارے باپ دادوں کو بھی دکھ اور خوشی پہنچتے رہے۔''

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

یوں اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا۔ اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کی پرورش کرنے والا ہے۔ (944)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

کہہ، کیا تم نے غور کیا اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لے جائے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے اللہ کے سوائے کون معبود ہے جو تم کو یہ لا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ پھر جاتے ہیں۔ (945)

944- دَابِرُ۔ دُبُرٌ کے معنی پیٹھ ہیں اور دَابِرٌ متأخر اور تابع کو کہتے ہیں یعنی جو پیچھے رہ جائے۔ مکان کے اعتبار سے ہو یا زمانہ کے یا مرتبہ کے۔ (غ) اور اصل یا جڑ بھی اس سے مراد لی جاتی ہے۔ (ج) دَابِرٌ **قوم کے کاٹ دینے سے مراد** قوم پر عذاب استیصال کا آنا ہے جس سے ان کی شوکت وقوت ٹوٹ جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب کے سب لوگ مر جائیں۔ اہل مکہ کا عذاب استیصال ان کا مغلوب ہو جانا ہی تھا۔ اور جنگ بدر کے ذکر میں ہے ﴿وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [الأنفال: 7:8] ''اور اللہ ارادہ کرتا تھا کہ اپنی پیشگوئیوں کے ذریعہ سے حق کو ثابت کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔'' حالانکہ ان کے چند سردار مارے گئے تھے مگر چونکہ قوم کی قوت ٹوٹ گئی اس لیے اس کو جڑ کاٹنے سے تعبیر کیا ہے۔

قوم کب ہلاک ہوتی ہے؟:

ظالم قوم کی ہلاکت کے بعد یہ لفظ لا کر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ بتایا ہے کہ کسی قوم کا استیصال اللہ تعالیٰ عالمین کی ربوبیت کے لیے کرتا ہے۔ یعنی جب قوم کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ ربوبیت عالمین میں حارج ہوتی ہے اور نیکی کی بالکل جڑ کٹنے لگتی ہے، تب اس کا استیصال کر دیا جاتا ہے۔

945- ﴿نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ﴾ تصریف کے معنی وہی ہیں جو صرف کے ہیں یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا۔ مگر تصریف میں کثرت پائی جاتی ہے۔ (غ)

یہ انہی لوگوں کو فرمایا جو رسول اللہ ﷺ کے مقابل میں سخت دلی اختیار کر رہے ہیں۔ پہلی قوموں کا حال سنا کر اب ان کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تم اسی طرح مخالفت میں لگے رہو گے تو جانتے ہو نتیجہ کیا ہوگا؟ تمہارے کان ہوں گے پر سنو گے نہیں، آنکھیں ہوں گی پر دیکھو گے نہیں، دل ہوں گے پر سوچو گے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا لے جانا یہی ہے کہ ان کے فائدے سے محروم کر دے گا، کیونکہ اس کا قانون یہی ہے کہ جب ایک قوت سے انسان کام نہیں لیتا تو وہ بیکار ہو جاتی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

کہہ بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر اچانک یا کھلا کھلا آ جائے (تو) کیا سوائے ظالم لوگوں کے کوئی (اور) ہلاک کیا جائے گا۔ (946)

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دیتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے۔ پس جو کوئی ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے۔

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور جو لوگ ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں انہیں عذاب پہنچے گا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع 5 9 11

کہہ دے، میں تم کو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم کو کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ کہہ، کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں؟ سو کیا تم غور نہیں کرتے۔ (947)

946- بَغْتَةً۔ اچانک جس کے نشانات پہلے سے ظاہر نہ ہوں۔ جَهْرَةً کھلا کھلا جس کی علامات بھی پہلے سے ظاہر ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب کبھی ایک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے کبھی دوسرے میں۔

947- محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خزانوں سے مالا مال کر دیا اور بہت سی آئندہ کی خبریں ان کو بتا دیں یہاں تک کہ جو جو حالات اس امت کو پیش آنے والے تھے وہ سب بتا دیئے۔ اور جب چاروں طرف شرک و بے دینی کی ظلمت پھیل رہی تھی آپ ایک فرشتہ کی طرح ہر ایک قسم کی آلائش سے پاک رہے۔ لیکن ایمان لانے کے لیے، نیکی کرنے کے لیے یہ لالچ نہیں دیتے۔ نیکی کی خاطر نیکی کرنا اعلیٰ سے اعلیٰ رنگ میں اس کی تعلیم اگر کسی نے دی تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ نے دی۔ اس لیے فرمایا

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور اس کے ساتھ ان کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ان کے لیے اس کے سوائے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ (948)

کہ ان کو کہہ دو کہ اللہ کے خزانوں کا مالک میں نہیں وہ جسے چاہے دے، غیب کا مالک میں نہیں، فرشتہ میں نہیں، تمہاری طرح بشر ہوں۔ پس میں تم کو حصول کمال انسانی کے لیے بلاتا ہوں۔ وہی اصل غرض میری دعوت کی ہے۔ مجھے قبول کرو تو اس میں کوئی دنیوی ملونی نہ ہو، کوئی نفسانی خواہش نہ ہو۔ فخر نوع انسان صرف کمال انسانی کی طرف بلاتا ہے۔

﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ میں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

1. اس میں ایک تو **رسول اللہ ﷺ کی عصمت پر شہادت** ہے کہ آپ صرف احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہیں نہ کسی خواہش نفس کی، نہ کسی دوسرے کی۔
2. دوسرے آپ کے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ قرآن شریف میں وحی تعلیم کے رنگ میں موجود ہے آپ اس سب کی پیروی کرتے ہیں۔ گویا جن کمالات کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ قرآن علم ہے تو آپ عمل ہیں۔
3. تیسرے آپ کے پیروؤں کو بتایا کہ وہ اگر کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اتباع قرآن کریم اور محمد رسول اللہ ﷺ ہی ان کے لیے ایک راہ ہے۔ اسی لیے آیت کا خاتمہ اس پر کیا ہے کہ اعمیٰ اور بصیر برابر نہیں۔ اعمیٰ وہ ہے جو ان کمالات سے غافل رہا، بصیر وہ ہے جس نے ان کو دیکھ لیا اور پھر ان کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آنحضرت ﷺ کا طریق عمل امور دینی میں قابل اتباع نہیں منشائے الفاظ کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں تو یہ بتایا ہے کہ جو عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو وہ آپ کی خواہش نفسانی سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے خواہ وہ وحی جلی ہو یا خفی۔

948- قرآن کریم کا اِنْذَار تو سب کے لیے ہے۔ یہاں خصوصیت سے بعض لوگوں کے اِنْذَار سے مراد یہ ہے کہ انہی کی صورت میں انذار کی غرض حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ اِنْذَار کی پروا نہیں کرتے اس لیے ان کو اِنْذَار کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یہ اِنْذَار جس کا یہاں ذکر ہے اس قبیل سے ہے جیسا فرمایا ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ﴾ [یٰسٓ: 11:36] ''تو صرف اسے ڈرا سکتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرتا ہے۔'' یا ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ [فاطر: 18:35] ''تو صرف انہیں ڈرا سکتا ہے جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں۔''

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

اوران کو نہ نکال جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی رضا چاہتے ہیں۔ تجھ پر ان کے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) نہیں اور نہ ان پر تیرے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) ہے کہ تو ان کو نکال دے۔ پس ظالموں میں سے ہو جائے۔ (949)

وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

اور اسی طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ تکلیفوں میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ کہیں کیا یہ وہی ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے۔ کیا اللہ شکر کرنے والوں کو نہیں جانتا؟ (950)

949- **مسلمان غربا کے متعلق کفار قریش کا مطالبہ:** پہلے مسلمان اکثر غربا میں سے تھے، بعض حبشی غلام تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے ساتھ مل کر بیٹھتے اور باتیں کرتے تھے۔ قریش اپنے فخر قومی پر نازاں تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو پاس سے اٹھا دو تو ہم تمہارے پاس بیٹھیں گے۔ مگر اسلام کا تو اصل مقصد ہی یہی تھا کہ انسانیت کے اشتراک کے سامنے تفریق رنگ و قوم، تفریق وجاہت و مرتبہ، تفریق مال و دولت کو مٹا دے۔ خدا کی رضا کو چاہنے والا ہی بڑا انسان ہے، خواہ کسی قوم سے ہو یا کسی رنگ کا ہو۔ اسی کے مطابق یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کا ہرگز یہ منشا نہیں، نہ کہیں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو نکال دینے کا ارادہ کیا تھا۔ بلکہ یہ کفار کے اس مطالبہ کا جواب ہے۔

950- فَتَنَّ کے اصل معنی سونے کا آگ میں ڈالنا ہے تاکہ میل دور ہو جائے۔ (غ) اسی طرح جب ایک انسان کو دکھوں میں ڈالا جاتا ہے تو اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جب غرض یہ ہو کہ اس کے کمالات اور خلوص کو ظاہر کیا جائے۔ کیونکہ تکالیف شاقہ میں پڑے بغیر کمالات ظاہر نہیں ہوتے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ غربا و ضعفا ملے، ان کو کفار نے نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھا بلکہ ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ نتیجہ کیا ہوا (لِيَقُوْلُوْا میں لام عاقبت کا ہے) کہ یہی غریب لوگ جب دکھوں میں ڈالے گئے تو ان کے کمالات دنیا میں ظاہر ہوئے اور آخر کفار کو بھی تعجب ہوا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر احسان کیا اور ان کو ایسے بلند مقام پر پہنچایا۔ مگر کس لیے؟ اس لیے کہ وہ شاکر تھے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی انہوں نے قدر کی اور ان کو ضائع نہیں کیا۔ **اس میں دنیا کی کمزور قوموں کے لیے خوش خبری ہے** کہ اگر وہ بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کریں تو ان کو بھی اللہ تعالیٰ بڑا بنا دے گا۔

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ تو کہہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے نادانی سے برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے تو وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (951)

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ ع 6 5 12

اور اسی طرح ہم باتوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

کہہ مجھے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کو تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو۔ کہہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا اس صورت میں گمراہ ہوں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔ (952)

951- ناواقفیت سے غلطی ہو جائے تو وہ قابل معافی ہے لیکن عمداً بدیوں پر اصرار کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو جان لینے کے باوجود بری راہ کو چھوڑنے کی کوشش نہ کرنا اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

952- نُهِيْتُ۔ نَهْيٌ کے معنی کسی چیز سے روکنا، قول سے ہو یا فعل سے اس میں کوئی فرق نہیں۔ ﴿وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ [النازعات: 40:79] ''اور نفس کو خواہش سے روکتا ہے۔'' میں یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے نفس کو کہتا ہے کہ تو بدی نہ کر، بلکہ اس سے مراد ہے عملاً شہوات سے اس کا الگ کر دینا اور جس چیز کی طرف نفس کی خواہش ہو اس سے بچ جانا۔ اسی لیے [نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ] کبھی ہاتھ سے ہوتی ہے، کبھی زبان سے اور کبھی دل سے۔ پھر خدا کی نہی کچھ اس عقل کی وجہ سے ہے جو اس نے ہم میں رکھی ہے اور کچھ اس شریعت کی وجہ سے جو اس نے ہم کو دی ہے۔ (غ)

آنحضرت ﷺ کا بت پرستی سے بچا رہنا:

یہاں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو غیر اللہ کی عبادت سے روکا گیا ہے۔ تو یہ روکنا قول سے تو نبوت کے بعد ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل سے آپ کو بچپن سے بت پرستی وغیرہ سے روکے رکھا۔ جیسا کہ تاریخ کی اس پر گواہی ہے کہ آپ کبھی مشرک نہیں

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾

کہہ میں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر (قائم) ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا۔ وہ میرے پاس نہیں جس کے لیے تم جلدی کرتے ہو۔ حکم اللہ ہی کا ہے۔ وہ حق بیان کرتا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔ (953)

ہوئے اور اسی طرف عقل اور فطرت سلیم نے آپ کو ہدایت کی۔ یہاں شرک کو ان کی اَھْوَآءَ قرار دے کر بتا دیا کہ فطرت اور عقل جو اللہ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے وہ توحید کی طرف ہی ہدایت فرماتی ہے۔

953- الْفٰصِلِیْنَ۔ فَصْلٌ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری سے الگ کر دینا۔ یہاں تک کہ دونوں میں فرق ہو جائے۔ اس لیے مکان سے الگ ہونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ ﴿وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ﴾ [یوسف: 94:12] ''اور جب قافلہ (مصر سے) چلا'' اور یَوْمَ الْفَصْلِ وہ دن ہے جو حق کو باطل سے الگ کر دیتا ہے۔ اسی سے فیصلہ کرنا ہے۔ (غ)

مفردات میں ہے کہ بَیِّنَةٍ کھلی دلیل کو کہتے ہیں، عقلی ہو یا محسوس۔ اور یہاں رسول اللہ ﷺ کے توحید پر قیام اور بت پرستی سے عملی بیزاری کو بَیِّنَةٍ کی وجہ سے بتایا ہے۔ یعنی جس چیز کی طرف وحی و عقل نے ہدایت کی ہے وہ ایک واضح دلیل ہے۔

وسعت رحمت الٰہی:

محمد رسول اللہ ﷺ جیسا وسیع دل انسان کوئی نہیں ہوا۔ اپنے دشمنوں سے جس قدر عملی نرمی اور محبت کا ثبوت آپ نے دیا ہے دوسرے کسی انسان کی زندگی میں وہ نہیں ملتا۔ لیکن خدا کا رحم اور محبت بہت بڑھ کر وسیع ہیں۔ فرماتا ہے کہ ان کے جرائم اس قدر ہیں کہ اگر انسان کے اختیار میں ان کا سزا دینا ہوتا تو خواہ رسول اللہ ﷺ ہی ہوتے ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صاف فرمایا ہے۔ مگر خدا بہت بردبار ہے اور انسان کو بڑی مہلت دیتا ہے۔ آج بھی اس کا وہی قانون کام کرتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں فلاں قوم جلد تباہ ہو جائے مگر وہ جو فیصلہ کرنے والا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کب کس کی تباہی کا وقت ہے؟

حکم خدا کے ماتحت حکم:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ سے یہاں مراد صرف دشمنوں کی سزا کا حکم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کسی انسان کے نہیں، جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اور کوئی حکم دینے والا ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ خلاف واقعات ہے۔ اہل قرآن کا اس آیت سے ان احکام دینی کے خلاف استدلال کرنا جو احادیث میں نبی کریم ﷺ کی زبان سے مروی ہیں سیاق و سباق عبارت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں ادنیٰ عقل سے بھی جو شخص کام لے گا وہ دیکھ لے گا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا کسی کو حکم دینا خدا کے حکم میں ہی داخل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہی سب احکام دیئے۔

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾

کہہ اگر وہ میرے پاس ہوتا جس کے لیے تم جلدی کرتے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۹﴾

اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں سوائے اس کے ان کو کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے۔ اور کوئی پتّا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں اور نہ تر اور نہ خشک، مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے۔ (954)

954- مَفَاتِحُ۔ مَفْتَحٌ کی جمع ہے جس کے معنی خزانہ ہیں۔ مِفْتَحٌ یا مِفْتَاحٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے جس کے معنی کنجی ہیں۔ مگر اول معنی جو سدی سے مروی ہیں یہاں زیادہ موزوں ہیں۔ مفردات میں دوسرے معنی لے کر یوں توجیہ کی ہے کہ مراد اس سے وہ اسباب ہیں جن سے اس کے اس غیب تک پہنچا جاتا ہے جس کا ذکر ﴿فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا﴾ [الجن: 26:72] ''سو وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب نہیں کرتا'' میں ہے۔

﴿كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جیسا کہ خود سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ ہر ایک چیز کے علم کا ذکر کر کے آخر پر یہ لفظ لائے ہیں جو اس علم کے قائم مقام ہیں۔ اور مفردات میں ہے کہ کتاب اللہ سے مراد اس کا علم اور اس کا حکم بھی ہوتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ اعمال کی جزا و سزا کا تعلق علم سے ہے۔ کوئی عمل ظاہر کرے یا چھپ کر کرے اللہ تعالیٰ اسے یکساں جانتا ہے۔ علاوہ ازیں خشک ہو کر گرنے والے پتے میں اس قوم کی طرف اشارہ بھی ہے جس کا عروج اب جانے والا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں دانہ جو اَب اُگ کر درخت بنے گا خود اسلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونا ہے، ہو کر تو رہے گا مگر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ترقی تدریجاً ہوگی۔ **بسا اوقات قرآن کریم کی دلیل دو کام کرتی ہے** ایک طرف اللہ تعالیٰ کے علم کامل کا ذکر کیا جو اس کی توحید کی دلیل ہے دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ قوموں کا زوال و عروج کس طرح ہوتا ہے اور کہ قوم کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب وہ خشک پتّا کی طرح خوبیوں سے خالی ہو جاتی ہے اور عروج ایک دانہ کی طرح ہوتا ہے جو زمین میں بو یا جاتا ہے اور درخت بن جاتا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۶۰ ع 7 5 13

اور وہی ہے جو رات کو تمہاری روح قبض کرتا ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ تم دن کو کرتے ہو پھر وہ تم کو اس میں اٹھاتا ہے تاکہ ایک مقررہ وقت پورا کیا جائے۔ پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو خبر دے گا جو تم عمل کرتے تھے۔ (955)

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ یُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝۶۱

اور وہ غالب ہے اپنے بندوں سے بالاتر (ہے) اور تم پر نگہبان بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے ہمارے بھیجے ہوئے اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ (956)

955- یَتَوَفّٰىكُمْ۔ تَوَفّٰی کے لیے [دیکھو نمبر: 444]۔ مفردات میں ہے [قَدْ عُبِّرَ عَنِ الْمَوْتِ وَالنَّوْمِ بِالتَّوَفِّيْ] یعنی **توفی سے مراد موت ہوتی ہے یا نیند**۔ تَوَفّٰی اصل میں قبض روح کا نام ہے۔ پھر اس کا استعمال دونوں حالتوں پر ہے، قبض تام جو موت کے وقت ہوتا ہے اور قبض ناقص جو نیند کے وقت ہوتا ہے۔ مگر یہ لفظ قبض روح کے لیے خاص ہے۔ جسم انسانی کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے پر بھی کبھی نہیں بولا جاتا۔ **نیند اور موت پر لفظ تَوَفّٰی کے مشترک طور پر بولنے میں یہ اشارہ ہے کہ جو چیز نیند کے وقت قبض کی جاتی ہے وہی موت کے وقت قبض کی جاتی ہے**۔ اور وہ تمیز ہے جس پر انسان کے اعمال کا مدار ہے اور جو حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز ہے۔ اسی لیے رات کی توفی کے بعد یہ فرمایا کہ جو دن کو تم کرتے ہو اسے جانتا ہے یعنی جب تمہاری تمیز تمہاری طرف لوٹ آتی ہے تب تمہارے اعمال محاسبہ میں آتے ہیں۔

جَرَحْتُمْ۔ جَرَحَ کے معنی ہتھیار کے ساتھ اثر کرنا یا زخم ہیں اور جَرَحَ الشَّیْءَ کے معنی کَسَبَ ہوتے ہیں یعنی کمایا۔ (ل) اور جوارح انسان کے اعضاء ہیں جن سے کھاتا ہے اور اِجْتِرَاحٌ کے معنی اکتساب یا اثم یا گناہ کا کمانا آتے ہیں۔ (غ) ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ﴾ [الجاثیۃ: 21:45] ''آیا وہ لوگ جو بدیاں کماتے ہیں گمان کرتے ہیں۔''

پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی ایک طرف علم الٰہی کا ذکر کیا ہے جو اس کی توحید پر دلیل ہے اور دوسری طرف بتایا کہ جو کچھ انسان حالت بیداری میں کرتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے اور اس پر وہ نتائج مترتب فرماتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے اور اس کی غرض کیا ہے؟ اگلے رکوع میں بیان فرمایا ہے۔

956- حَفَظَةً۔ حَافِظٌ کی جمع ہے مراد اعمال انسانی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۝

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

پھر وہ اپنے مولا برحق کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سنو حکم اسی کا ہے۔ اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ

کہہ کون تم کو خشکی اور تری کی مشکلات سے نجات دیتا ہے؟ (جب) تم اس کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارتے ہو، اگر وہ ہم کو اس سے نجات دے تو ہم یقیناً شکر کرنے والوں

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ [الانفطار: 82:10-12] ''اور یقیناً تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں معزز لکھ لینے والے جو تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔''

حفاظت اعمال کا قانون:

اور یہ جو فرمایا ﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الرعد: 13:11] ''اس کے لیے اس کے آگے اور پیچھے (اعمال کا) پیچھا کرنے والے ہیں جو اسے اللہ کے حکم سے محفوظ کر لیتے ہیں۔'' تو اس سے بھی مراد یہی اعمال کی حفاظت کرنے والے ملائکہ ہیں اور يَحْفَظُوْنَهٗ اس لیے فرمایا کہ یہی چیز انسان میں سے حفاظت کے قابل ہے کیونکہ اسی سے انسان کی دوسری زندگی یا زندگی بعد الموت پیدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی فرمایا ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾﴾ [قٓ: 50:4] یعنی ''جو چیز زمین ان سے کم کرتی ہے اس کو ہم جانتے ہیں اور ہمارے پاس کتاب ہے جو محفوظ رکھ لیتی ہے۔'' یعنی جو حفاظت کے قابل چیز ہے وہ محفوظ رکھ لی جاتی ہے اور اجزائے زمینی زمین میں مل جاتے ہیں۔ اس حفاظت اعمال کو بتانے کی غرض یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور جو کام کرے یہ سمجھ کر کرے کہ اس کا ایک نتیجہ بھی پیدا ہوگا جسے وہ دیکھ کر رہے گا۔

توفی میں جسم نہیں لیا جا سکتا:

﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ رسول یا بھیجے ہوئے یہاں وہ ملائکہ ہیں جو ارواح کو قبض کرتے ہیں۔ اگر توفی کے معنی جسم کو لینے کے ہوتے تو یہاں الفاظ چاہتے ہیں کہ وہی معنی لیے جاتے کیونکہ یہاں نہ صرف خدا انسان کو پورا لینے کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ساتھ کہہ دیا کہ وہ کوئی کمی نہیں کرتے۔ یعنی کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑتے جو لینے کے قابل ہو۔ پس اگر توفی میں جسم خاکی بھی کبھی لینے کے قابل ہوتا تو سب انسانوں کے جسم خاکی بھی ملک الموت کو ساتھ لے جانے چاہئیں ﴿ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ ''پھر اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔'' اگلی آیت میں بھی قابل غور ہے۔ حالانکہ جسم خدا کی طرف نہیں لوٹائے جاتے بلکہ ارواح لوٹائی جاتی ہیں۔

مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

میں سے ہوں گے۔ (957)

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

کہہ دے اللہ تم کو ان سے اور ہر سختی سے نجات دیتا ہے پھر تم شرک کرتے ہو۔ (958)

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

کہہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں کئی فرقے بنا کر ملا دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھا دے۔ دیکھ ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھ لیں۔ (959)

957- ظُلُمَاتٌ سے مراد یہاں شدائد ہیں یعنی مشکلات۔ [يَوْمٌ مُظْلِمٌ] اس دن کو کہتے ہیں جس میں بڑی تکالیف پیش آئیں۔ (ل)
تَضَرُّعًا۔ حالت عاجزی میں چونکہ انسان بے بس ہو کر گڑگڑاتا ہے اس لیے مراد علی الاعلان پکارنا ہے یعنی بلند آواز سے۔ اور آخرت سے دنیا کے عذاب کی طرف مضمون کو منتقل کر کے سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف بندہ کی اصلاح چاہتا ہے۔ چنانچہ جب اس دنیا میں انسان پر دکھ آتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس تکلیف سے نجات عطا فرما دیتا ہے۔

958- كَرْبٌ شدید غم کو کہتے ہیں۔ اس کا اصل مفہوم زمین کو کھود کر الٹ پلٹ کرنا ہے۔ پس ایسا غم جو نفس میں اس طرح ہیجان پیدا کرے كَرْبٌ ہے۔ (غ)
بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم اس قدر بڑا ہے کہ تم شرک کرتے کرتے بھی جب اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو تو وہ تمہاری مصیبت کو دور کرتا ہے مگر باوجود اس کے پھر جب تکلیف سے نکلتے ہو تو خدا کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس مہذب زمانہ میں بھی یہی حال ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت کے بت مال و دولت اور سلطنت ہیں۔ ان کی پرستش دلوں پر ایسی غالب ہے کہ اس کے سامنے خدا کا نام بھی بھول جاتا ہے۔ ہاں جب تکلیفیں انتہا کو پہنچتی ہیں تو خدا یاد آتا ہے۔

959- **فوق اور تحت کے عذاب سے مراد:** ﴿مِنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ﴾ سے ایک مراد تو اوپر اور نیچے سے جیسے ہواؤں، آندھیوں یا زلزلوں، غرق وغیرہ سے لی گئی ہے مگر زیادہ قرین قیاس [اَئِمَّةُ السُّوْءِ] یعنی اعلیٰ اور [سُفْلَةُ النَّاسِ] یعنی ادنیٰ طبقہ یعنی امرا یا ضعفاء ہیں۔ (ج) بعض وقت ایک قوم اس لیے ہلاک ہو جاتی ہے کہ ان کا اعلیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہے اور بعض وقت اس لیے کہ عوام الناس یا ادنیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہے یا وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے ہیں یعنی عوام الناس تو وہ بڑوں کو

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾

اور تیری قوم نے اسے جھٹلا دیا حالانکہ وہ حق ہے۔ کہہ میں تم پر داروغہ نہیں۔

ہلاک کر دیتے ہیں جیسے بولشویک۔

﴿يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾۔ لَبَسَ کے معنی خلط ملط کر دینا ہیں یعنی باہم فساد ہو جائے۔

اعدائے اسلام میں باہم جنگ کا عذاب:

اس آیت میں نبی کریم ﷺ کے مخالفین کا ذکر ہے جو توحید الٰہی کو دنیا میں پھیلنے سے روکتے ہیں۔ مگر قرآن کریم چونکہ ہمیشہ کے لیے ہے اور اس کا پیغام توحید بھی دنیا میں ہمیشہ ہی پہنچتا رہے گا اور لوگ بھی اس کی مخالفت ہمیشہ ہی کرتے رہیں گے اس لیے آئندہ زمانہ کے مخالف بھی اس میں شامل ہیں۔ حدیث میں بعض قوموں کا ذکر آتا ہے جو آخری زمانہ میں اسلام کو مٹانا چاہیں گے اور ان کے متعلق آتا ہے [لَا يَدَانِ لِأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ] (صحيح مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذِكْرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ: 7560) ''ان کے ساتھ جنگ کرنے کی مسلمانوں کو طاقت نہیں ہوگی۔'' اس لیے ان کے لیے عذاب بھی اسی رنگ کا ہوگا کہ وہ خود باہم جنگ وجدال سے ایک دوسرے کو کمزور کر دیں اور قرآن کریم میں جو عیسائیوں کا ذکر آتا ہے ﴿وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ [المآئدة: 64:5] ''اور ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔'' وہ اسی کا مؤید ہے۔ یعنی باہم بغض وعداوت ان کے لیے عذاب کا رنگ اختیار کر لے گا۔ آج اگر ایک طرف عالمگیر جنگ قرآن شریف کی اس پیشگوئی کو سچا ثابت کر رہی ہے تو دوسری طرف بولشوزم کا خطرہ بھی ﴿يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ کا نظارہ ہی پیش نظر کر رہا ہے۔ ہاں چونکہ قرآن کریم کے ہر بیان میں دہری غرض ہے اس لیے مسلمانوں کو بھی ضمناً سمجھایا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدال نہ کریں۔ ورنہ یہ ان کی کمزوری کا موجب ہو جائے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ **اس امت کی ہلاکت کا موجب ان کا باہمی فساد ہوگا**۔ ابوداؤد میں ہے [وَلَا يُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِّنْ سِوَىٰ أَنْفُسِهِمْ فَيَسْتَبِيْحَ بَيْضَتَهُمْ] (سنن أبي داؤد، كتاب الفتن، باب ذِكْرِ الْفِتَنِ وَدَلَائِلِهَا: 4254) یعنی ''ان کے اپنے لوگوں کے سوائے دوسرا کوئی دشمن ان پر مسلط نہ کرے گا جو ان کو بالکل نیست ونابود کر دے۔ بلکہ باہم جنگ و جدال سے ہلاک ہوں گے۔'' مسلمانوں کی تاریخ پر جو شخص غور کرے گا وہ دیکھ لے گا کہ مسلمانوں کے باہمی فساد ہی ان کی ہلاکت کا موجب ہوئے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے لیے سرخ وسفید خزانوں کا وعدہ:

اسی حدیث میں آتا ہے کہ مجھے دو خزانے دیئے گئے ہیں۔ ایک اَحْمَرُ یعنی سرخ اور ایک اَبْيَضُ یعنی سپید۔ یہ سپید خزانہ ملنا ابھی باقی ہے۔ آپ کے خزانے آپ کی امت ہی ہیں۔ اسلام کی پہلی ترقی مشرقی ممالک کی طرف رہی۔ اب مغربی ممالک میں اس

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

ہر ایک خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم جان لو گے۔ (960)

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۸﴾

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں کے متعلق بیہودہ باتیں کرتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے یہاں تک کہ اس کے سوائے کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔ اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔ (961)

کے ظہور کا وقت آیا ہے اور یہی سپید خزانہ ہے۔ پس عذاب استیصال اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پہلے دشمنوں پر بھی اسی رنگ کا بھیجا کہ ان کی شوکت ٹوٹ کر وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور پچھلے مخالفوں کے لیے بھی ایسا ہی مقدر معلوم ہوتا ہے۔

960- مُسْتَقَرٌّ۔ قَرَّ کے معنی ہیں ایسا ٹھہر گیا کہ وہاں سے ہلا نہیں۔ کیونکہ قُرٌّ ٹھنڈک کو کہتے ہیں جو سکون کو چاہتی ہے۔ جس طرح گرمی حرکت کو چاہتی ہے اسی سے قُرَّةُ عَيْنٍ ہے آنکھ کی ٹھنڈک اور زمین کو قَرَارٌ اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ انسان کے لیے اِسْتِقْرَارٌ کی جگہ ہے۔ (غ) اور مُسْتَقَرٌ استقرار کی جگہ ہے اور یہاں مراد وقت استقرار وقوع ہے۔ مراد یہ ہے کہ پیشگوئی تو پوری ہو کر رہے گی مگر اپنے وقت پر۔

961- خوض کے لیے [دیکھو نمبر: 749]۔

مجلس استہزا میں شمولیت سے روکنے کی وجہ غیرت دینی ہے: یہاں مخاطب رسول اللہ ﷺ نہیں بلکہ ہر ایک مسلمان سامع ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے اس لیے روکا ہے کہ ان کی صحبت کے اثر سے متاثر ہو جائے گا اور دین کی عظمت دل سے نکل جائے گی [دیکھو نمبر: 749] جہاں منافقوں کے ذکر میں پھر اس سے روکا ہے۔ قرآن کریم کی ہر ایک تعلیم اعلیٰ درجہ کے اعتدال پر مبنی ہے۔ تنگ دل لوگوں کی طرح عام اصول نہیں بنا دیا کہ فلاں قوم چونکہ تمہاری مخالف ہے اس لیے ان کے پاس مت بیٹھو، ان سے بات چیت نہ کرو۔ نہ ہی افراط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ صحبت بد کے اثر کی پرواہی کوئی نہ کی ہوتی۔ صورت اول میں دنیا کے کاروبار رک جاتے۔ صورت ثانی میں لوگ اپنے اخلاق اور روحانیت کو تباہ کر بیٹھتے۔ اس لیے فرمایا کہ مل کر بیٹھنے، باتیں کرنے کی ضرورتیں تو ناگزیر ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایسی صحبتوں کو عام کرتے کرتے یہاں تک نوبت پہنچے کہ مذہبی بے غیرتی کو قبول کر لو۔ اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر علانیہ ہنسی ہو رہی ہو تو ایسی مجلسوں میں بھی شریک رہو۔ اس خاص بات کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ روحانیت کو ایک بدیہی نقصان پہنچانے والی چیز ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنے اخلاق اور روحانیت

وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور ان لوگوں پر جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) نہیں لیکن یہ نصیحت ہے تاکہ وہ بچیں۔ (962)

وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖۗ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع 8 10 14

اور ان لوگوں کو چھوڑ دے جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور بے حقیقت تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ نصیحت کر کہ کوئی جان اس کی وجہ سے جو اس نے کمایا ہلاک (نہ) کی جائے اس کے لیے اللہ کے سوائے کوئی دوست نہیں اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ اور اگر ہر ایک قسم کا بدلہ دینا چاہے تو اس سے نہ لیا جائے گا۔ یہ وہ ہیں جو اس کی وجہ سے جو انہوں نے کمایا ہلاک کیے گئے۔ ان کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہوگا اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔ (963)

کو کھلا نقصان پہنچتا دیکھے تو ایسی صحبت کو ترک کرے۔ آج کل کی بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مجالس بھی اس نقصان سے خالی نہیں۔ بوجہ ناواقفیت دین کے یہ لوگ بجائے کوئی مفید گفتگو کرنے کے ایسی باتوں میں لگے رہتے ہیں جن کا اثر دین کو نقصان ہے۔ کسی کی غیبت، کسی کی عیب جوئی، کچھ ہنسی ٹھٹھا ہوتا ہے۔ پھر رات کو بہت دیر تک یہ مجالس گرم رہتی ہیں۔ نماز سے محروم رہتے ہیں۔ صبح دیر سے اٹھتے ہیں۔ دین و دنیا دونوں کو برباد کرتے ہیں۔

962- یہاں یہ بتایا کہ ساتھ بیٹھنے سے یہ تو نہیں کہ انسان ان کے افعال کا ذمہ دار ہو جاتا ہے بلکہ یہ ایک نصیحت ہے تاکہ مسلمان خود ان کے اثر بد سے بچتے رہیں یا مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے پاسِ خاطر سے وہ لوگ بھی دین کے ساتھ استہزا کرنے سے بچ جائیں۔

963- تُبْسَلَ۔ بَسْلٌ کے معنی کسی چیز کا روک دینا ہیں اور یہاں مراد ثواب سے محروم کر دینا ہیں۔ (غ) حرام اور بَسْلٌ میں فرق یہ ہے کہ حرام وہ ممنوع ہے جو حکم سے ہو یعنی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ چیز مت کھاؤ یا قہر سے کہ اسے جبراً روک دیا جائے۔ گو یہ عام ہے

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۫ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۷۱﴾

کہہ کیا ہم اللہ کے سوائے اسے پکاریں جو ہم کو نفع نہیں دیتا اور نہ ہی ہم کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور کیا ہم اپنی ایڑیوں پر لوٹائے جائیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں سیدھا رستہ دکھا دیا اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین کے اندر حیران بنا کر خواہشات کی پیروی میں لگا دیا۔ اس کے ساتھی ہوں جو اس کو ہدایت کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس آ جا۔ کہہ اللہ کی ہدایت وہی (کامل) ہدایت ہے اور ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم جہانوں کے پروردگار کی فرمانبرداری کریں۔ (964)

اور بَسَلٌ خاص ہے یعنی جس سے قہراً روک دیا جائے۔ (غ)

حَمِيْمٍ۔ سخت گرم یا کھولتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں۔ اور حمام مشہور ہے اور حَمِيْمٌ دوست کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ دوست کی وجہ سے خشمناک ہوتا ہے اور حُمّٰى بخار کو کہتے ہیں۔ (غ)

ہم صحبتوں کو نصیحت کی ضرورت:

یہاں یہ بتایا ہے کہ یہ کافی نہیں کہ ایسے ہم نشینوں سے ہی بچے جو دین سے استہزا کرتے ہیں بلکہ جن کے پاس بیٹھے ان کو نصیحت بھی کرتا رہے۔ بِهٖ میں ضمیر قرآن شریف کی طرف ہی جاتی ہے اور نصیحت کا پیرایہ یہ بتایا کہ اپنے آپ کو ثواب یعنی اعلیٰ مقامات سے محروم کر لینا اچھا نہیں۔

964- اسْتَهْوَتْ۔ اس کا مادہ هَوٰى ہے، جس کے معنی نفس کا شہوات کی طرف میلان ہے۔ اور هَوِيَ کے معنی [سُقُوْطٌ مِنْ عُلُوٍّ اِلٰى سُفْلٍ] ہیں یعنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا۔ (غ) گویا شہوات کی طرف میلان بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہے۔ اسْتَهْوَتْهُ کے معنی راغب نے کیے ہیں [حَمَلَتْهُ عَلَى اِتِّبَاعِ الْهَوٰى] یعنی اس کو خواہشات کی پیروی پر لگا دیا اور دوسرے معنی کے لحاظ سے بلند مقام سے گرا دینا بھی معنی ہو سکتے ہیں ماحصل ایک ہے۔ هَوٰى کے دوسرے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 1659]۔

حَيْرَانَ۔ حَارَ يَحَارُ سے ہے جس کے معنی ہیں متردد ہوا۔ پس حیران جو متردد ہو یعنی نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا۔

خدا کی فرمانبرداری کے خلاف دوسری حالت خواہشات کی پیروی ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ ایک مسلمان اگر اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی

وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور کہ نماز کو قائم کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

الثلثة

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۬ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن کہے گا کہ ہو تو وہ ہو جائے گا۔(965) اس کا فرمانا حق ہے۔ اور اسی کے لیے بادشاہت ہے جس دن صور میں پھونکا جائے گا وہ غیب اور ظاہر کا جاننے والا، اور وہ حکمت والا خبردار ہے۔(966)

اتباع کرے تو اس کی مثال اس شخص کی ہے جو شیاطین کے پیچھے لگ کر ایسا بھٹک جائے کہ پھر اسے رستہ نہ ملتا ہو اور یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری میں انسان کے قلب کو اطمینان ملتا ہے مگر خواہشات کی پیروی میں ایک تردد اور اضطراب اس کے لاحق حال رہتا ہے۔ کبھی ایک طرف جھکتا ہے کبھی دوسری طرف اور یوں ایک بلند مقام سے گر کر ذلیل حالت میں آ جاتا ہے اور اصحاب جو اسے بلاتے ہیں وہ اس کے پہلے ساتھی ہیں۔

965- ﴿يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ اس میں اشارہ بعث بعد الموت کی طرف ہے۔ آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا یعنی کسی غرض کے لیے۔ پس اسی غرض کے لیے جو تکمیل نفس انسانی ہے جو خلاصہ موجودات ہے۔ یہ ضروری ہوا کہ اس عالم کی کمی کو اس عالم میں پورا کیا جائے اور اعمال انسانی سے انسان کو پیدا کرنا اس کے لیے مشکل نہیں جس نے پہلے اتنی مخلوق پیدا کی۔

966- صُوْرٍ کے عام معنی قرن یا سینگ کے ہیں جیسے بگل۔ لیکن لسان العرب میں صُوَرُ کو صُوْرَةٌ کی جمع بھی قرار دیا ہے۔ اور قتادہ اور حسن کی قراءت بجائے صُوْرِ کے صُوَرْ ہے جو صُوْرَةٌ کی عام جمع ہے۔ اس پر دونوں طرح اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ صُوَرَ قراءت درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ صُوْرَةٌ کی جمع صُوْرٌ غلطی ہے۔ مگر دوسری قراءت صریحاً منقول ہے اور صُوَرُ صُوْرَةٌ کی جمع لسان العرب میں مسلم ہے۔ اور ابو عبیدہ نے بھی یہ کہا ہے اور جوہری نے کلبی سے یہ کہا ہے۔ ہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حدیث میں صُوْر کی جگہ قَرْنٌ کا لفظ بھی آتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ [نَفَخَ فِي الصُّوْرِ] یا [نَفَخَ فِي الْقَرْنِ] سے سچ مچ کا سینگ مراد لینا بھی درست نہیں۔ ایسے الفاظ جو قیامت کے متعلق بولے گئے ہیں ان کی صحیح حقیقت کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ صُوْر یا قَرْنٌ میں نفخ کرنے والے ملائکہ ہوں گے اور ملائکہ کا قرن بھی کسی اور رنگ کی شے ہی ہوگی نہ وہ سینگ جس کے ذریعہ سے انسان بگل بجاتے ہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ مراد تو ﴿نُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ سے حشر ہے نہ کچھ اور۔ بگل بھی جمع کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ پس ﴿يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ﴾ سے اصل مراد صرف حشر یا اکٹھا کرنا ہی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ حشر

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۷۴

اور جب ابراہیم نے اپنے بزرگ آزر کو کہا کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ (967)

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت دکھاتے رہے اور تاکہ وہ یقین کرنے

جیسا کہ قرآن شریف کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے ارواح کا صورتوں میں پھونکا جانا ہے۔ پس قرآن کریم نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہے اور یہ دوسرے معنی پہلے معنی کے کسی طرح منافی نہیں۔

967- آبٌ ہر شخص کو جو کسی کے وجود میں لانے یا اس کی اصلاح یا اس کے ظہور کا سبب ہو آبؔ کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی باپ بھی آتے ہیں اور چچا، دادا اور دیگر بزرگوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور معلم پر بھی۔ ﴿وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ﴾ [الزخرف: 22:43] ''اپنے بزرگوں کو ایک طریق پر پایا۔'' میں اٰبَآءَنَا سے مراد علماء لیے گئے ہیں۔ جنہوں نے ان کی علم سے ربوبیت کی کیونکہ دوسری جگہ ہے ﴿اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا﴾ [الأحزاب: 67:33] ''ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی۔'' (غ)

مذہب توحید کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے کیونکہ آپ سے موحدین کی ایک عظیم الشان نسل چلتی ہے جو دنیا میں معلم توحید ہوئی ہے۔ اور یہ انبیاء علیہم السلام میں آپ کا فخر ہے۔

آزر کون تھا؟ آزر کو ابراہیم کا آبؔ کہا ہے۔ آیا اس سے مراد باپ ہے یا کوئی اور بزرگ؟ اس میں شک نہیں کہ پہلے خیال اسی طرف جاتا ہے کہ وہ آپ کے والد ہوں۔ اس کے خلاف ایک تو یہ امر ہے کہ توریت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح لکھا ہے۔ اور پھر عرب کے نساب بھی اس پر متفق ہیں اور زرقانی نے بھی تارح ہی لکھا ہے۔ مگر اس کا جواب تو یہ ہے کہ عربی میں آکر نام کی صورت بدل جاتی ہے اور علاوہ ازیں یوسیبٹس ایک یہودی مورخ نے تارح کو آتھر لکھا ہے جو آزر سے بالکل ملتا ہے۔ لیکن دوسری دقت یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے اس کے خلاف شہادت ملتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر ہو۔ کیونکہ سورۃ ابراہیم میں یہ صاف ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے میں یہ دعا کی ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ [ابراهيم: 41:14] ''اے ہمارے رب میری حفاظت فرما اور میرے ماں باپ کی اور مومنوں کی جس دن حساب ہو۔'' حالانکہ اس آبؔ کے متعلق ہے ﴿وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ [التوبة: 114:9] ''اور ابراہیم کا اپنے آبؔ کے لیے استغفار صرف ایک وعدہ کے سبب سے تھا جو اس سے کیا تھا۔ پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے

الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾

والوں میں سے ہو۔(968)

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾

سو جب اس پر رات چھا گئی اس نے ستارہ دیکھا۔ کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا۔ کہا میں ڈوب جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔(969)

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾

پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا کہا اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔

بریت کی۔'' پس اس آبؔ کے لیے بڑھاپے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مغفرت کی دعا نہ کر سکتے تھے۔ پس آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہ تھے کوئی اور بزرگ تھے۔

968- **انبیاءؑ کے لیے نورِ عقل کی ہدایت:** یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتدا سے ہی شرک وغیرہ معاصی سے پاک ہوتے ہیں۔ اور قبل از وحی قانون قدرت کا مطالعہ بھی ان کو حق کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی فطرت صحیح ہوتی ہے۔ ان کا نور قلب دھندلا نہیں ہوتا، ان کی عقل ٹھوکر نہیں کھاتی، ان کا فکر ان کو صحیح نتائج پر پہنچاتا ہے۔

969- ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ مُوْقِنِيْنَ میں سے تو ابراہیم علیہ السلام پہلے ہی ہو چکے تھے اور بت پرستی سے، شرک سے بیزار، بلکہ دوسروں کے شرک پر تعجب کرتے ہیں ﴿اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً﴾ اس لیے وہ ستارہ کو دیکھ کر کبھی دل میں یہ وہم بھی نہیں لا سکتے کہ وہ ان کا رب ہے۔ اگلی دو آیات کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ان کا اپنی قوم کے ساتھ مباحثہ ہو رہا ہے کیونکہ جب ان کی قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج بھی ڈوب جاتا ہے تو وہ صاف اس قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ اور پھر آگے صاف آتا ہے ﴿وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ﴾ [الأنعام: 83:6] ''اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے خلاف دی۔'' پس هٰذَا رَبِّيْ استفہام انکاری ہے جس میں حرف استفہام محذوف ہے۔ جیسے موسیٰ کے قول میں فرعون کے لیے ﴿وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [الشعرآء: 22:26] ''اور یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا ہے۔'' جس کے معنی ہیں کیا یہ نعمت ہے؟ یا بطور استعجاب ہے۔

﴿فَلَمَّآ اَفَلَ﴾ اَفَوْلَ اجرام نورانی کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے چاند، ستارہ وغیرہ۔ ستارہ کے ڈوب جانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جو چیز کبھی سامنے آ جائے اور کبھی غائب ہو جائے وہ **خود انسان کی طرح کسی**

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾

پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا' کہا اے میری قوم میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو۔(970)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۷۹﴾

میں نے یکسو ہو کر اپنا منہ اس کی طرف کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَ لَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا۔ کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو؟ اور اس نے مجھے یقیناً ہدایت کی ہے اور میں اس سے نہیں ڈرتا جس کو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ ہاں یہ کہ میرا رب کچھ چاہے۔ میرے رب کا علم تمام چیزوں کو لیے ہوئے ہے۔ پس کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟(971)

قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور معبود نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک جسمانی چیز ہے جو کبھی آنکھوں کے سامنے اور کبھی غائب ہے۔ ﴿اِنِّیْ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ جس چیز سے تم محبت کرتے ہو وہ خود بے اختیار ہے۔ خدا سے محبت کرنے سے تو ایسا تعلق اس ذات پاک سے پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر وہ اس انسان سے الگ نہیں ہوتا۔ مگر ایسی چیز سے محبت کا کیا فائدہ جو خود قانون کے اندر اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ محبت کرنے والا تڑپتا رہ جائے وہ غائب ہو جاتی ہے۔

970- معلوم ہوا کہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا کیونکہ اس پر لا کر ختم کر دیا۔ ﴿هٰذَاۤ اَكْبَرُ﴾ میں جو ﴿هٰذَا رَبِّیْ﴾ کی طرح استفہام انکاری ہے یہ بتا بھی دیا ہے یہی وجہ ہے کہ [البقرة: 258:2] میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کو مغرب سے نکالنے کا مطالبہ کیا ہے۔

971- جیسا کہ باطل پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہے جب ابراہیم علیہ السلام کے دلائل کا کوئی جواب بن نہیں آیا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ڈرایا ہے کہ ہمارے دیوتا تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ اسی کا جواب دیا ہے کہ مجھے ان سے کچھ خوف نہیں۔ ہاں مشیت ربی کے ماتحت

وَ كَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور میں کس طرح اس سے ڈروں جس کو تم شریک بناتے ہو اور تم نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ اسے شریک بنایا ہے جس کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نہیں اتاری۔ پس دونوں گروہوں میں سے کون امن کا زیادہ حقدار ہے؟ اگر تم جانتے ہو۔ (972)

وقف لازم

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع 9 12 15

جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا انہی کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت پانے والے ہیں۔ (973)

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے خلاف دی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں مرتبہ میں بلند کرتے ہیں۔ تیرا رب حکمت والا جاننے والا ہے۔ (974)

کوئی نقصان پہنچے تو پہنچے اس سے میں گھبراتا بھی نہیں۔

972- ﴿مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا﴾ کسی نبی کی تعلیم میں یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرک کا حکم دیا ہے یا صرف یہ مراد ہے کہ کوئی عقلی دلیل شرک کی موجود نہیں۔

973- ظلم کے مختلف معنی میں سے ایک شرک بھی ہیں۔ اور حدیث متفق علیہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہاں ظلم کے معنی شرک بیان فرمائے اور قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: 13:31] ''کہ شرک یقیناً بڑا بھاری ظلم ہے۔'' اور خود اس سورت کا مضمون بھی توحید ہی ہے۔ پس ایمان کے بعد اگر شرک کی ملونی نہ ہو تو انسان امن کو پالے گا ورنہ نہیں۔

974- یہ دلیل جس کا یہاں ذکر ہے، توحید الٰہی پر ہے جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا اور اسی توحید پر قائم ہونے کو ہی بلندیٔ درجات قرار دیا ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ توحید پر مضبوطی سے قائم ہو جانا تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور اسی سے مراتب بلند ہوتے ہیں۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۙ﴿۸۴﴾

اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب دیئے۔ ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہم نے پہلے سے ہدایت دی اور اس کی نسل سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت دی)۔ اور اسی طرح ہم احسان کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔ (975)

وَ زَكَرِیَّا وَ یَحْیٰى وَ عِیْسٰى وَ اِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۙ﴿۸۵﴾

اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔

وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ الْیَسَعَ وَ یُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴿۸۶﴾

اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط اور (ان) سب کو ہم نے قوموں پر فضیلت دی۔ (976)

975- یہاں ہدایت دینے سے مراد توحید الٰہی پر قائم کرنا ہے۔ ذُرِّیَّتِهٖ میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی جاسکتی ہے مگر اولیٰ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف پھیرنا ہے اور قریب تر بھی نوح علیہ السلام ہی ہیں اور لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت سے نہیں۔

976- **بعض انبیاءؑ کے ناموں کو اکٹھا کرنے کی وجہ اور غیر تاریخی ترتیب میں حکمت:** ان آیات میں اٹھارہ انبیاء علیہم السلام کے نام لیے ہیں یعنی اول ابراہیم علیہ السلام پھر آپ کا بیٹا اسحاق علیہ السلام پھر اسحاق کا بیٹا یعقوب علیہ السلام پھر ابراہیم علیہ السلام کے جدِ نوح علیہ السلام جن کی ذریت کا آگے ذکر کیا ہے۔ یہاں تک تو ایک ترتیب ہے مگر اس سے آگے بلحاظ زمانہ کوئی ترتیب نہیں رکھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے زمانوں کی ترتیب کی خبر نہ تھی۔ کیونکہ اس سے اگلی ہی سورت میں نہایت صفائی سے انبیاء کا ذکر ترتیب تاریخی میں کیا ہے۔ بلکہ یہاں ایک اور رنگ کی ترتیب دی ہے یعنی اول ظاہری شوکت کے لحاظ سے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر کیا۔ جن کو عظیم الشان بادشاہتوں کا مالک بنایا گیا۔ پھر دکھوں اور تکلیفوں میں صبر کے بلند مقام کے لحاظ سے ایوب اور یوسف علیہما السلام کا ذکر کیا۔ ان دونوں کو صبر کے بعد اللہ تعالیٰ نے بلند مقام پر پہنچایا۔ پھر قوم کو نہایت ذلت کی حالت سے نکال کر اعلیٰ مقام پر پہنچانے کے لحاظ سے اور قوم کو ایک قانون اور راہ بتانے کے لحاظ سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر کیا۔ یہ چھ نبی ایسے ہیں کہ کسی نہ کسی رنگ میں ان کو بادشاہت یا سرداری یا حکومت ملی ہے۔ اس لیے ان کے بعد ﴿نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کے بعد زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس علیہم السلام کا ذکر کر کے ان کو صرف صالحین کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ یعنی ان کے صرف ایک پہلو زہد کامل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں ان کو کوئی حکومت کا رنگ نہیں ملا۔ زکریا، یحییٰ، عیسیٰ علیہم السلام کا ایک ہی زمانہ اور ایک ہی

وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾

اور ان کے باپ دادوں میں سے اور ان کی نسل سے اور ان کے بھائیوں سے۔ اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ہم نے ان کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت دی۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

یہ اللہ کی ہدایت ہے اس کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کے وہ عمل ان کے کام نہ آتے جو وہ کرتے تھے۔ (977)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ

یہ وہ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت دی، (978) سو

رنگ، سادگی، زہد، عبادت کا ظاہر ہے۔ الیاس علیہ السلام کا اسی رنگ میں آنا خود اس سے ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی آمد کو الیاس کی آمد ثانی قرار دیا گیا اور اس بات کی شہادت انجیل میں موجود ہے کہ یحییٰ الیاس علیہ السلام کے رنگ اور اس کی روح میں آیا [لوقا: 1-17] پھر اس کے بعد اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط علیہم السلام کا ذکر کر کے ان کی فضیلت کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ ان چاروں کی تحقیر کی گئی ہے۔ جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تو نبوت سے ہی انکار کیا گیا ہے اور ان کو کسی ابراہیمی وعدہ کا وارث نہیں سمجھا جاتا اور لوط علیہ السلام کی نبوت کا بھی انکار کیا جاتا ہے اور یونس علیہ السلام کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے حضور سے بھاگ گئے تھے۔ ان کی فضیلت کا خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا کہ ان کی تحقیر ہوئی ورنہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی فضیلت دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ **کس طرح قرآن شریف ایک الزام کو دور کرنے کے لیے ایک نبی کے متعلق بعض تعریفی الفاظ بیان کرتا ہے**۔ اسی اصول کو نہ سمجھنے سے عیسائیوں نے یہ ٹھوکر کھائی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق تعریفی کلمات سے ان کی دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ مراد صرف الزامات کا دور کرنا تھا۔ اس طرح ظاہر الفاظ پر جائیں تو یہاں سے ان چار انبیاء علیہم السلام کی دیگر سب انبیاء علیہم السلام پر اور مسیح علیہ السلام پر فضیلت ماننی۔

977- یہاں ہدایت کا مقابلہ شرک سے کر کے صاف بتا دیا کہ ہدایت دینے سے مراد توحید پر قائم کرنا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی نبی شرک کا مرتکب نہیں ہوا کیونکہ کسی کا حبط عمل نہیں ہوا۔ اور جتنے اس قسم کے قصے بن گئے ہیں وہ سب بائبل میں تحریف ہے۔

978- باوجود اس کے کہ بعض کو بادشاہت ملی بعض کو نہیں۔ ایک امر میں ان سب کا اشتراک بیان فرمایا ہے کہ ان سب کو کتاب اور حکم اور نبوت ضرور ملے ہیں۔ کتاب وہ وحی ہے جو نبی پر اس کی امت کی ہدایت کے لیے نازل ہوتی ہے۔ حکم وہ اختیار ہے جو نبی کو دیا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا مطیع نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو اپنی اطاعت کی طرف بلاتا ہے جو اس کی امت کہلاتے ہیں اور نبوت بلحاظ لغت وہ پیشگوئیاں ہیں جو اس کو دین کی تائید کے لیے دی جاتی ہیں اور یا اس سے مراد یہاں سفارت ہے [دیکھو نمبر: 91]

النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَ
كَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اگر یہ لوگ ان کا انکار کریں تو ہم نے اس کو ایسے لوگوں کے سپرد کیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ (979)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ
اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ
هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع 10 8 16

یہ وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ سو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔ کہہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ وہ صرف جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔ (980)

اور گو کتاب اور حکم نبوت میں شامل ہیں مگر ان دو خاص باتوں کا ذکر اس لیے کیا تا معلوم ہو جائے کہ منصب نبوت کی یہ ضروری شرائط ہیں یعنی ایک کتاب کا دیا جانا، دوسرا حکم یا اختیار کا دیا جانا۔

979- هٰٓؤُلَآءِ میں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو ان انبیاء علیہم السلام کے اتباع کہلاتے ہیں جیسے یہود و نصاریٰ۔ دوسری قوم آنحضرت ﷺ کے اتباع کی ہے جو سب انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جو انبیاء علیہم السلام کے پیرو کہلاتے ہیں اور ضرورت نبوت سے واقف ہیں نہ مانیں تو ہم ایک اُمی قوم کو وہ علوم دے کر کھڑا کر دیں گے۔ یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے بعد اہل کتاب سے خطاب ہے۔ [آیت نمبر: 92, 93] میں اس خطاب کو واضح کر دیا ہے۔

980- اقْتَدِهْ میں ها تَسْكِيْت کے لیے ہے اور اقتدا پیروی کو کہتے ہیں یعنی جس نمونہ پر ایک انسان پہلے چلا ہے اسی پر چلنا۔

آنحضرت ﷺ کو یہ ارشاد کہ تم ان انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کی اقتدا کرو اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے اللہ تعالیٰ وہ ہدایت تو خود آنحضرت ﷺ کو دے چکا یعنی اپنی وحی سے دے چکا۔ اور مزید برآں ان انبیاء علیہم السلام کی کوئی کتابیں دنیا میں موجود نہ تھیں کہ ان کو پڑھ کر عمل کرنے کی ہدایت ہوتی۔ اور جو کچھ ان کی تعلیم باقی رہ گئی وہ خود ظنیات میں سے تھی۔ پس اُن کی ہدایت کے اقتدا سے مراد صرف ان کے طریق کی موافقت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح توحید کے قائم کرنے میں انہوں نے مشکلات کا مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی صبر سے اس کام کو کرو۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ ﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ بتاتے ہیں کہ یہاں مراد پیغام توحید کا پہنچانا ہے۔ ہاں ان الفاظ میں ایک اور اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ہدایت کے معنی منزل مقصود تک پہنچانا ہیں، یعنی کمال انسانی کو حاصل کرنا۔ اب اس رکوع کی سب سے پہلی آیت میں توحید الٰہی کو ہر قسم کی بلندیٔ درجات کا اصل موجب ٹھہرایا تھا اور فی الحقیقت مختلف قسم کے کمالات انسانی توحید کے مختلف پہلوؤں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پس کسی نبی کی ہدایت اس کا ایک خاص کمال انسانی کو حاصل کرنا ہے۔ کسی کمال انسانی کو ابراہیم علیہ السلام اپنے اندر لیتے ہیں، تو کسی کو موسیٰ علیہ السلام، کسی کو ہارون علیہ السلام، کسی کو داؤد علیہ السلام، کسی کو سلیمان علیہ السلام، کسی کو عیسیٰ علیہ السلام، کسی کو یحییٰ علیہ السلام، کسی کو ایوب علیہ السلام وَقِسْ عَلٰى هٰذَا۔ پس ﴿فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ **جن جن کمالات کو ان انبیاء علیہم السلام نے حاصل کیا ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر جمع کرو۔** وہاں کوئی داؤد علیہ السلام، کوئی سلیمان علیہ السلام، کوئی ایوب علیہ السلام، کوئی عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔ تو جن کمالات انسانی کا

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

اور انہوں نے اللہ کو نہیں پہچانا (جس طرح) اس کے پہچاننے کا حق (تھا) جب یہ کہا کہ اللہ نے انسان پر کچھ نہیں اتارا۔ کہہ کس نے وہ کتاب اتاری جو موسیٰ لایا؟ لوگوں کے لیے نور او رہدایت تھی تم اس کو ورق ورق کرتے ہو۔ اس (کے ایک حصہ) کو ظاہر کرتے ہو اور بہت سا چھپاتے ہو۔ اور تمہیں وہ باتیں سکھائی گئیں جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا۔ کہہ اللہ ہی نے (اتارے) پھر ان کو چھوڑ دے اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔ (981)

اظہار کرنے کے لیے یہ الگ الگ نبی ہوئے ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر لو۔ یہاں اقتداء سے مراد شرائع کی پیروی لینا بالکل غلط ہے۔ ایسی پیروی کا حکم ہوتا تو پھر پہلے اللہ تعالیٰ ان تمام کی کتابوں کو تحریف سے پاک کر کے آپ کو دیتا۔ اور آنحضرت ﷺ کا عمل بھی یہ ثابت کرتا یعنی عملاً آپ پہلی شرائع کی باتوں کو لے کر ان پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ پس یہ معنی نبی کریم ﷺ کے عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ آخری الفاظ میں قرآن شریف کو عالمین کے لیے نصیحت قرار دینا اسی معنی کی تائید کرتا ہے اور یا اُولٰٓئِكَ میں اشارہ او پر والی قوم کی طرف ہے یعنی صحابہ کی طرف اور یہاں خطاب عام ہے یعنی اے مسلمانوں تم صحابہ کا اقتدا کرو۔ اور حدیث میں ہے [أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ، فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ] (جامع الصغير للسيوطي) ''میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کا اقتدا کرو گے ہدایت پالو گے۔'' اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقتدا سے مراد صرف مطابقت ہے۔

981- قَدَرُوا اللّٰهَ۔ قدر کے اصل معنی کسی چیز کی مقدار کا واضح کر دینا یا اس کا اندازہ کرنا ہیں اور یہاں مراد اس کا پہچاننا یا شناخت کرنا ہے۔ (غ) بعض نے تعظیم کرنا یا وصف بیان کرنا بھی مراد لیا ہے۔ غرض ایک ہی ہے۔

قَرَاطِیْسَ۔ قِرْطَاسٌ کی جمع ہے جس کے معنی کاغذ ہیں۔ قَرَاطِیْسَ بنانے سے مراد ورق ورق کرنا یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔

یہود کا انکارِ نبوت:

پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ سب انبیاء علیہم السلام کا مذہب توحید کا تھا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کا مذہب ہے۔ بلکہ آپ سب کے کمالات کے جامع ہیں۔ پس ان انبیاء علیہم السلام کے پیرو کہلانے والوں کا رسول اللہ ﷺ کا انکار کس قدر جائے تعجب ہے۔ مگر انہوں نے یعنی اہل کتاب نے انکار کیا بلکہ سرے سے ہی انکار کر کے کہہ دیا کہ اب کسی بشر پر کچھ بھی نہیں اترتا۔ ﴿مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کا مطلب یہ

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا برکت دی گئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس کے پہلے ہے تاکہ تو (اہل) مکہ کو ڈرائے اور ان کو جو اس کے گرد ہیں۔ اور جو لوگ آخر پر ایمان لاتے ہیں اس پر (بھی) ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ (982)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے؟ یا کہے میری طرف وحی کی گئی ہے اور اس کی طرف کچھ وحی نہیں کی گئی۔

نہیں کہ کبھی کچھ نہیں اتارا بلکہ یہ کہ اب کچھ نہیں اتارا۔ کیونکہ وہ دوسری شریعت کا انکار کرتے تھے۔ چنانچہ سدی کا قول ابن جریر میں منقول ہے کہ یہودی کہتے تھے [مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ مِّنْ شَیْءٍ] اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں صاف وعدہ ہے کہ ایک نبی موسیٰ کی مانند کھڑا کیا جائے گا مگر ساتھ ہی فرمایا کہ تمہاری جو اس کے پیرو کہلاتے ہو اب یہ حالت ہے کہ تم نے اپنی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ایک حصہ کو ظاہر کرتے ہو مگر بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو یعنی ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ اس کا جواب چونکہ ان کے پاس کوئی نہیں یعنی وجہ انکار کوئی نہیں اس لیے آنحضرت ﷺ کو ارشاد ہوا کہ تم کہو وہ اللہ تعالیٰ نے ہی اتاری تھی اور اسی کے وعدہ کے مطابق اب یہ کتاب اترتی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اور تصریح کر دی کہ یہ اسی پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ پس اس کا انکار کیونکر کر سکتے ہو۔ یہ آیات مدنی نہیں گو خطاب یہود سے ہے جیسا کہ پچھلے رکوع میں بھی ان کا ذکر کیا ہے ﴿اِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ﴾ جیسا کہ اسی سورت کی [آیت 21] میں ذکر ہے کہ اہل کتاب آنحضرت ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ ان متواتر خطابوں کے ایک ایسی سورت میں ہوتے ہوئے جو بالاتفاق کلیۃً اور جملۃً واحدۃً مکہ میں نازل ہوئی یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوتا ہے کہ **مکی سورتوں میں یہود یا اہل کتاب سے خطاب نہیں** کیا۔ سورۂ بنی اسرائیل مکی نہیں جس میں یہود سے خطاب ہے یا سورۂ مریم مکی نہیں جس میں عیسائیوں سے خطاب ہے۔

982- مُبٰرَكٌ۔ بَرَكَ کے اصل معنی کسی چیز کا لازم ہو جانا ہیں اور بَرَكَةٌ کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا مضبوطی سے قائم ہو جانا ہے۔ پس مبارک وہ ہے جس میں ایسی بھلائیاں ہوں۔ (غ) بالفاظ دیگر جس کی خیر لازم ہو جائے اور منقطع نہ ہو۔ اور درود شریف میں جو آتا ہے بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ تو اس کے معنی کیے ہیں کہ اے اللہ جو تو نے محمد (ﷺ) کو بزرگی اور کرامت عطا فرمائی ہے اسے ثابت اور دائم رکھ۔ (ل) اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بَرَكَةٌ کے معنی [اَلْكَثْرَةُ فِیْ كُلِّ خَیْرٍ] مروی ہیں یعنی ہر

وَ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى

اور جو کہے میں اس کی مثل اتار سکتا ہوں جو اللہ نے اتارا۔(983) اور اگر تو دیکھے جب ظالم موت کی سختیوں میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلا رہے ہوں، اپنی جانوں کو نکالو۔ آج تم کو رسوائی کا عذاب اس کے بدلے میں دیا

بھلائی میں کثرت۔ اور قرآن کریم کے لیے جو مبارک آتا ہے اس کے معنی کیے ہیں: ''جس کی جانب سے خیر کثیر آتی رہتی ہے۔'' (ل)

اُمَّ الْقُرٰی۔ مکہ کا نام ہے اس لیے کہ زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی۔ (غ) یعنی وہ زمین کا مرکز ہے اور اس کے لفظی معنی بستیوں کی ماں ہیں۔ مگر صرف عرب کی بستیوں کی نہیں۔ ماں اس کو اس لیے کہا کہ ساری دنیا کے لیے روحانی غذا یہیں سے ملتی ہے اور پھر اسے کل اہل دنیا کا قبلہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ اور لوگ اس کی طرف اکٹھے ہوتے ہیں۔ جیسے بچے ماں کی طرف اور یوں بھی پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے اور نئی دنیا اس کے نیچے ہے۔ پس وہ معنی اپنے ظاہر میں بھی درست ہیں جو امام راغب نے کیے ہیں۔ یہاں اُمَّ الْقُرٰی سے مراد اہل ام القریٰ ہیں۔

مَنْ حَوْلَهَا جب مکہ بستیوں کا مرکز ہوا تو ظاہر ہے کہ مَنْ حَوْلَهَا میں کل دنیا آ گئی۔

قرآن کی فضیلت دیگر کتب پر:

یہاں اس کتاب کی مزید فضیلت کا ذکر کیا۔ اول یہ کہ وہ مبارک ہے یعنی اس کی خیر کبھی منقطع نہ ہوگی جس طرح پہلی کتابوں کی خیر منقطع ہوگئی۔ قرآن کریم کو توریت اور انجیل کے مقابل یا پہلی کتابوں کے مقابل پر مبارک کہنے سے منشا یہ ہے کہ اس کی برکات دائم رہیں گی، دوسرے وہ مصدق ہے، تیسرے کل عالم کی طرف ہے جیسا کہ ﴿اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ سے ظاہر ہے۔

یہ بھی بتا دیا کہ آخر پر ایمان لانے والے اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ انکار صرف وہی کریں گے جو صرف دنیا پر جھکے ہوئے ہیں اور دنیا کی آلائشوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ کمال انسانی کے حصول کی طرف جو آخرت پر ایمان کی اصل غرض ہے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

983- یہ سب نبی کریم ﷺ کے **مختلف قسم کے مخالف** ہیں۔ بعض شرک وغیرہ کے عقائد بناتے تھے یا جیسے عیسائی جو اللہ تعالیٰ کی طرف ایک باطل تعلیم منسوب کرتے تھے اور یہ سب اللہ پر افترا تھا۔ بعض آپ کے مقابل پر جھوٹے مدعیان نبوت یا وحی تھے یا کہانت کرتے تھے۔ یا بعض جیسے نضر بن الحارث یہ کہتے تھے کہ ہم بھی قرآن جیسی وحی بنا سکتے ہیں۔ دوسری جگہ ان کا قول مذکور ہے ﴿لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ﴾ [الأنفال: 31:8] ''اگر ہم چاہیں، تو اس کی مثل کہہ لیں۔'' اور یہ جو بعض مفسرین نے

اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

جائے گا جو تم اللہ پر ناحق کہتے تھے اور تم اس کی باتوں سے تکبر کرتے تھے۔ (984)

وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَ مَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع 11 4 17

اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جیسے ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو عطا کیا تھا وہ تم اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے وہ سفارشی نہیں دیکھتے جو تم سمجھتے تھے کہ تمہارے بارے میں (ہمارے) شریک ہیں۔ یقیناً تمہارے تعلقات کٹ گئے اور وہ تم سے جاتا رہا جو تم جھوٹے دعویٰ کرتے تھے۔ (985)

یہاں **عبداللہ بن سعد بن ابی سرح** کا نام لیا ہے کہ اس کو وحی لکھتے لکھتے: ﴿وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ﴾ [المؤمنون: 23:12-14] ''اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھہرنے کی جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا۔ اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بنائیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اسے ایک اور پیدائش دے کر اٹھا کھڑا کیا۔'' اس عجیب بیان کو سن کر بول اٹھا ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ؕ﴾ [المؤمنون: 23:14] ''پس اللہ بابرکت ہے (جو) سب بنانے والوں سے بہتر (ہے)۔'' اور یہی اگلی وحی کے الفاظ تھے جس پر وہ مرتد ہو گیا تو یہ روایت معتبر نہیں۔

984- غَمَرٰتِ۔ غَمْرٌ کے اصل معنی کسی شے کے اثر کو دور کرنا ہیں اور غَمْرَةٌ بہت سے پانی کو کہتے ہیں جو اپنی جائے قرار کو ڈھانک لیتا ہے اور اسی سے غَمْرَةٌ جہالت کے معنی میں آتا ہے ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ﴾ [الذاريات: 51:11] ''جو جہالت میں بھولے ہوئے ہیں۔'' ﴿فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ﴾ [المؤمنون: 23:54] ''سو انہیں اپنی جہالت میں پڑا رہنے دے۔'' اور موت کے شدائد کو بھی غَمَرَاتٌ کہا جاتا ہے۔ (غ)

﴿اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ حکم کے طور پر نہیں بلکہ موت کی سختی کا ذکر کیا ہے کیونکہ وہ دنیا سے اس قدر محبت کرتے ہیں اور اپنے وقت کو ضائع کر دینے پر اس قدر متأسف ہوتے ہیں کہ نہیں چاہتے کہ ان کی جان نکلے۔ مسلم کو موت کے وقت یہ دکھ نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ لقاء اللہ کا امیدوار ہوتا ہے۔

985- فُرَادٰى۔ فَرِيْدٌ اور فَرْدٌ کی جمع ہے اور فَرْدٌ وہ ہے جس کے ساتھ اس کا غیر نہ ملے ﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا﴾ [الأنبياء: 21:89]

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾

اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے، زندہ کو مردہ سے نکالتا رہتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ یہی اللہ ہے پھر تم کہاں سے الٹے پھر جاتے ہو۔ (986)

''میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑیو۔''

خَوَّلْنٰا۔ خَوْلٌ مال یا مقبوضات کو کہتے ہیں اور تَخْوِيْلٌ کے معنی ہیں ان چیزوں کا عطا کرنا جن کے تعہد کا انسان محتاج ہے۔(غ)

﴿تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ﴾ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں [وَقَعَ التَّقَطُّعُ بَيْنَكُمْ] یعنی تمہارے درمیان انقطاع واقع ہو گیا اور یوں بھی [تَقَطَّعَ وَصْلَكُمْ بَيْنَكُمْ] تمہارے درمیان جو ملاپ یا تعلق تھا وہ کٹ گیا۔

یہاں سمجھایا ہے کہ آخری ذمہ داری ہر انسان کی فرداً فرداً ہے وہ مال و متاع جس کے بھروسہ پر انسان خدا کو چھوڑتا ہے سب یہیں رہ جاتا ہے اور اس وقت کوئی ساتھی ساتھ نہ ہوگا۔ بڑوں اور چھوٹوں میں جو تعلقات ہیں وہ بھی کٹ جائیں گے اور جن کی خاطر برائیاں کی تھیں وہ ساتھ نہ ہوں گے۔

986- فَالِقُ۔ فَلَقٌ کسی چیز کا پھاڑ دینا اور اس کے بعض کا بعض سے الگ کر دینا اور فَلَقٌ صبح کو بھی کہتے ہیں۔(غ)

﴿الْحَبِّ وَ النَّوٰى﴾ حَبٌّ اور حَبَّةٌ گیہوں اور جو وغیرہ کے دانہ کو کہا جاتا ہے۔(غ) اور نَوٰى۔ نَوَاةٌ کی جمع ہے کھجور کی گٹھلی اور نَوٰى کے معنی نیت بھی ہیں۔(ل)

تُؤْفَكُوْنَ۔ اِفْكٌ ہر ایک چیز جو اس حالت سے پھیری گئی ہو جس پر اسے ہونا چاہیے تُؤْفَكُوْنَ کے معنی ہوں گے۔ اعتقاد حق سے باطل کی طرف اور سچائی سے جھوٹ کی طرف اور اچھے افعال سے فعل قبیح کی طرف پھیرے جاتے۔(غ) اور ﴿لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا﴾[الأحقاف: 22:46] ''کہ ہمیں اپنے معبودوں سے پھیر دے۔'' وہ اپنے نقطہ خیال سے کہتے ہیں اور اسی لیے اِفْكٌ جھوٹ کو کہا جاتا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ﴾[النور: 11:24] ''جو جھوٹ بنا لائے۔'' اسی سے اَفَّاك ہے ﴿اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾[الشعرآء: 222:26] ''جھوٹ بنانے والے گنہگار۔''

اس رکوع میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے نظارے دکھا کر اس کی توحید کا اثبات کیا ہے اور دوسری طرف ساتھ ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ وہ صداقت جو نبی کریم ﷺ لائے ہیں ایک دانہ کی طرح نشوونما پاتے پاتے آخر کار دنیا میں غالب ہوگی۔ ایک ہی ترکیب لفظی میں دونوں خیالات کو ظاہر کرنا کمال بلاغت اور کمال علم پر دلالت کرتا ہے۔

دانہ اور گٹھلی کو پھاڑ کر اس میں سے پودے اور درخت بنانا کتنی بڑی قدرت کا کام ہے۔ حق بھی مثل ایک دانہ یا گٹھلی کے ہے۔ جس طرح ایک گٹھلی ایک ناواقف کی نظر میں نہیں جچتی اور وہ نہیں جانتا کہ اس سے ایک عظیم الشان درخت بن جائے گا۔ اسی طرح حق کے مخالف اس سے ناواقف ہیں کہ وہ حق جس کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں کس طرح ایک دن دنیا میں مقبول ہوگا۔ زندہ کو

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾

وہ صبح کو پھاڑنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام کے لیے بنایا اور سورج اور چاند کو حساب کے لیے۔ یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے۔ (987)

وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ ان کے ذریعہ سے خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ۔ ہم نے باتیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو علم رکھتے ہیں۔ (988)

مردہ سے نکالنے کے یہی معنی ہیں کہ ایک کام کے لیے بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتے مگر اللہ تعالیٰ اس کو سرسبز کر دیتا ہے۔ اور جس طرح ایک گٹھلی زمین میں پھٹ کر اپنے موافق غذاؤں کو زمین سے اور ہوا سے حاصل کر کے ایک درخت بن جاتی ہے اسی طرح جو امر حق ہے وہ بھی اپنی قوت کے سامان گردوپیش سے حاصل کر کے دنیا میں آخر پھیل جاتا ہے اور مردوں کو زندہ سے نکالنا یہ ہے کہ مخالفت اور مقابلہ کی قوت کو جس میں زندگی کے سارے سامان نظر آتے ہیں توڑ کر بالکل مردہ کر دے اور یا یہاں اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم کو جو اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہو مردہ کر دے گا۔ اور ایک ایسی قوم کو جسے مردہ سمجھا جاتا ہے کامیاب اور بامراد کر دے گا۔ جاہلوں میں سے عالم اور عالموں میں سے جاہل پیدا کر دے گا۔ يُخْرِجُ میں استمرار ہے اور مخرج میں اور اگلی آیت میں فَالِقُ میں پیشگوئی کا رنگ ہے۔

987- تَقْدِيْرُ۔ قَدَرٌ اور تَقْدِيْرٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ ایک چیز کے اندازہ کا واضح کر دینا اور تقدیر کے معنی قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں۔ (غ) اور اللہ کی **تقدیر اشیاء** دو طرح پر ہے۔ ایک ان کو قدرت عطا کر کے اور دوسرے ان کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص اندازہ اور خاص وجہ پر بنانا۔ (غ)

رات کی تاریکی بھی سکون اور آرام کا موجب ہوتی ہے۔ پس اس کی مخلوق میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں۔ مگر اس رات کی تاریکی کو پھاڑ کر اب صبح نمودار ہونے والی ہے۔ سورج اور چاند کو حساب کے لیے کہہ کر بتا دیا کہ کس طرح یہ سب عالم ایک نظام میں منسلک ہے جس کے بنانے والی بڑی طاقتور ہستی ہے (حِسَابٌ اور حُسْبَانٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔)

988- جس خدا نے اس قدر سامان انسان کے فوائد جسمانی کے لیے بنا رکھے ہیں کیا اس نے اس کی اصل تکمیل کی غرض کا ہی کوئی سامان پیدا نہیں کیا، یہ نہیں ہوسکتا۔ پس جس کو یہ علم ہے کہ انسان کا اصل کمال محض کھانے پینے میں نہیں وہ یقیناً جان لے گا کہ تکمیل روحانی کا سامان بھی ضرور اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے [أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ] میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

اور وہی ہے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سونپا جانے کی جگہ۔ ہم نے باتیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ (989)

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور وہی ہے جس نے اوپر سے پانی اتارا پھر اس کے ساتھ ہم ہر طرح کی روئیدگی نکالتے ہیں۔ پھر اس سے ہم سبز (کونپلیں) نکالتے ہیں اس سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔ اور کھجور سے اس کے گابھے میں سے جھکے ہوئے گچھے۔ اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے۔ اس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھل لائے اور اس کے پکنے کو (دیکھو)۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ (990)

989- مُسْتَقَرٌّ کے اصل معنی جائے قرار، مُسْتَوْدَعٌ کے معنی جائے سپردگی ہیں۔ مفسرین نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مُسْتَقَرٌّ زمین میں اور مُسْتَوْدَعٌ قبور میں قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ دونوں زندگیوں کے لیے یعنی دنیوی اور اخروی کے لیے ایک ایک مُسْتَقَرٌّ ہے اور ایک ایک مُسْتَوْدَعٌ۔ دنیوی زندگی کے لیے مُسْتَقَرٌّ رحم مادر ہے اور مُسْتَوْدَعٌ پیدائش کے بعد موت تک اور اخروی زندگی کے لیے مُسْتَقَرٌّ قبر ہے اور مُسْتَوْدَعٌ قیامت۔

990- خَضِرًا اُخْضَرّ سبز رنگ کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد سبز کونپلیں ہیں ﴿فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً﴾ [الحج: 63:22] ''تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔'' ﴿ثِیَابًا خُضْرًا﴾ [الکهف: 31:18] ''سبز کپڑے۔''

مُتَرَاكِبًا۔ رُكُوْبٌ کے اصل معنی انسان کا حیوان کی پیٹھ پر ہونا ہیں اور مُتَرَاكِبٌ وہ ہے جس کا بعض بعض پر چڑھا ہوا ہو یعنی تہہ بہ تہہ۔

طَلْعٌ۔ طَلْعٌ سورج کے نکلنے پر بولا جاتا ہے طلوع الشّمس، مطلع الشّمس، مطلع الفجر اور کھجور کے گابھہ کو سورج کے طلوع سے مشابہت

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع 12 6 18

اور اللہ کے لیے جن شریک بنا رکھے ہیں حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے علمی سے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کر لیے ہیں۔ وہ پاک اور اس سے بلند ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ (991)

کے لحاظ سے طَلْعٌ کہا جاتا ہے۔ (غ)

قِنْوَانٌ۔ قِنْو گچھا یا خوشہ کو کہتے ہیں تثنیہ اور جمع قِنْوَانٌ ہے۔

دَانِيَةٌ۔ دُنُوّ قرب کو کہتے ہیں ذات سے ہو یا حکم کے لحاظ سے اور مکان اور زمانہ اور مرتبہ میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ (غ) اور دَانِيَةٌ سے مراد جو بوجھ سے جھک کر قریب ہو گئے ہوں۔

حَبٌّ اور نَوٰی کو پھاڑ کر اللہ تعالیٰ کیا بناتا ہے۔ مردہ دانہ زندہ ہو کر سرسبز ہوتا ہے کونپلیں نکلتی ہیں اور آخر پھر دانے بن جاتے ہیں۔ گٹھلی سے باغ، کھجور وغیرہ یہ بھی ایک وقت پھل لاتے اور پھر وہ پھل پکتے ہیں۔ اسی طرح حق بھی بڑھے گا، پھولے گا اور پھر پھلے گا۔ ایمان والوں کے لیے اس میں نشان اس لیے کہا کہ حق پر ان کا ایمان ہے۔ اس کے بڑھنے، پھلنے کو مثال سے سمجھا دیا۔ آج پھر حق ایک دانہ یا گٹھلی کی طرح زمین کی تاریکی میں بظاہر غائب ہوتا نظر آتا ہے مگر وہ اسی طرح درخت بن کر نکلے گا جس طرح پہلے درخت بنا تھا۔

991- اَلْجِنَّ۔ جِنّ کے معنی کسی چیز کا حاسہ سے چھپانا ہیں ﴿جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ﴾ [الأنعام: 76:6] ''اس پر رات چھا گئی۔'' اور جن روحانی یعنی غیر مرئی ہستیاں ہیں جو حواس سے چھپی ہوئی ہیں اور یہ انس کے مقابلہ پر ہیں۔ اور اس لحاظ سے ملائکہ کو بھی ان میں داخل کیا گیا ہے۔ مگر بعض کے نزدیک جن صرف خاص قسم کی غیر مرئی ہستیاں ہیں یعنی کل غیر مرئی ہستیاں تین قسم کی ہیں۔ اول اخیار یعنی ملائکہ، دوم اشرار یعنی شیاطین، سوم درمیانی جن میں اخیار بھی ہیں اور اشرار بھی یعنی جن۔ (غ)

خَرَقُوْا۔ خَرْقٌ کسی چیز کا قطع کرنا ہے۔ فساد کے طور پر بغیر تدبر اور تفکر کے ﴿اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا﴾ [الكهف: 71:18] ''کیا تو نے اسے پھاڑ دیا تاکہ اس کے سواروں کو غرق کر دے۔'' اور یہ خَلْقٌ کی ضد ہے اور خَلْقٌ ایک فعل کا کرنا ہے جو اندازہ اور نرمی سے ہو اور خرق بغیر اندازہ کے ہے۔ (غ)

<u>دو قسم کے شرک</u> کا ذکر کیا ہے۔ ایک جنوں کو شریک بنانے کا، دوسرے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرنے کا۔ بیٹا عیسائیوں نے بنایا ہے اور بعض دیگر مذاہب نے۔ بیٹیاں عرب کے بت پرست تجویز کرتے تھے۔ جن کے شریک بنانے میں مجوسیوں کے عقیدہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو <u>اہرمن</u> کو خالق شر قرار دیتے ہیں اور تمام قسم کے شرکاء بھی اس میں آ جاتے ہیں کیونکہ وہ نظروں سے مستور ہی ہوتے ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

آسمانوں اور زمین کا عجیب پیدا کرنے والا۔ اس کا بیٹا کس طرح ہوسکتا ہے؟ اور اس کی کوئی جورو نہیں، اور اس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (992)

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾

یہ اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں ہر چیز کا پیدا کرنے والا۔ سو اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ (993)

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے اور وہ باریک باتوں کا جاننے والا خبردار ہے۔ (994)

992- شرک کا سب سے زیادہ دھوکا دینے والا پہلو **خدا کا بیٹا بنانا ہے**، اسی کو پہلے لیا ہے۔ اس کی اصل تردید تو بَدِيْعُ کے لفظ میں ہے [دیکھو نمبر: 149] لیکن ایک لفظ پرست قوم کو جس نے صرف ظاہر الفاظ سے دھوکا کھایا ہے اور حقیقت پر غور نہیں کیا۔ ظاہر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ بیٹا اکیلے باپ سے کبھی پیدا نہیں ہوتا، جس جنس کا باپ ہے اسی جنس سے ماں تجویز کرو۔ ماں انسان اور باپ خدا! پھر تیسرا جواب دیا کہ سب چیز کا خالق اللہ ہے۔ اگر بیٹا ہے تو چاہیے تھا کہ کچھ مخلوق وہ بھی پیدا کرتا۔ چوتھا جواب علم میں دیا ہے کیونکہ انجیل میں شہادت موجود ہے کہ بیٹا پورا علم نہ رکھتا تھا نہ اسے غیب کا علم تھا نہ قیامت کا۔ پس صفات میں کوئی اشتراک نہیں تو بیٹا کیسا۔ یوں اشتراک ناقص تو کل مخلوق کو حاصل ہے مگر اس سے اسے الگ کرنے کے لیے کسی بات میں اشتراک کامل بھی دکھانا چاہیے اور وہ ہے نہیں۔

993- یہاں ہر قسم کے شرک فی العبادت کی تردید کی۔ اکثر لوگ اپنے معبودوں کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ سب کا کارساز وہی ہے۔

994- تُدْرِكُ۔ دَرْكٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 755]۔ نیچے جانے کے لحاظ سے درک کہا جاتا ہے۔ جیسے اوپر جانے کے لحاظ سے دَرَجٌ اور اس لیے سمندر کی انتہائی گہرائی کو بھی دَرْكٌ کہا جاتا ہے۔ اور پانی تک پہنچنے کے لیے جب ایک رسہ کے ساتھ دوسرا رسہ ملایا جاتا ہے تو اسے دَرْكٌ کہا جاتا ہے۔ اور انسان کو جو پیچھے آنے والی چیز سے پہنچتا ہے اسے بھی دَرْكٌ کہتے ہیں ﴿لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى﴾ [طٰهٰ: 77:20] ''نہ تجھے پکڑا جانے کا خوف ہے اور نہ تو (غرق ہونے سے) ڈر۔'' اور اَدْرَكَ کے معنی کسی چیز کی

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾

تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں آ چکی ہیں۔ سو جو کوئی دیکھتا ہے تو وہ اپنی جان (کی بھلائی) کے لیے ہے اور جو اندھا رہا اسی پر (وبال) ہے۔ اور میں تم پر نگہبان نہیں۔ (995)

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ

اور اسی طرح ہم باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں تو نے (خوب) پڑھا ہے اور تاکہ ہم اسے ان

غایت کو پہنچ گیا۔ [بَلَغَ اَقْصَی الشَّیْءِ]۔ ﴿حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ﴾ [یونس: 90:10] ''یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا۔'' یہی لفظ یہاں ہے اور اَبْصَارٌ سے مراد بعض نے یہاں آنکھ کو لیا ہے اور بعض نے بصیرت اور اس کے معنی اس کے مطابق ہیں جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے [یَا مَنْ غَایَةُ مَعْرِفَتِهِ الْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِهِ] کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غایت معرفت اشیاء کا جاننا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شے اس سے نہیں یعنی اس جنس کی اور نہ اس کی مثل ہے بلکہ وہ ہر چیز کا موجد ہے جہاں تک انسان کی غایت معرفت پہنچ سکتی ہے اور تَدَارُكٌ فریادرسی اور نعمت میں اکثر آتا ہے ﴿لَوْ لَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ [القلم: 49:68] ''اگر اسے اپنے رب کی نعمت نہ پالیتی۔'' اور اِدَّارَكَ بھی اصل میں تدارک ہی ہے ﴿حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا﴾ [الأعراف: 38:7] ''یہاں تک کہ جب سب اس کے اندر ایک دوسرے کو پالیں گے۔'' یعنی ایک دوسرے کو مل گئے اور ﴿بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ﴾ [النمل: 66:27] یعنی آخرت کو پانے میں ان کا علم انتہا کو پہنچ گیا سو وہ اس سے جاہل رہ گئے۔ (غ)

اللَّطِیْفُ۔ لِطَافَةٌ اور لُطْفٌ کے معنی ہلکی حرکت اور باریک امور کو پانا ہیں۔ اور لطائف ان امور کو کہتے ہیں جن کو حواس نہ پاسکیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لطیف ہونے سے یہ مراد بھی ہوتی ہے کہ وہ دقائق امور سے واقف ہے اور یہی یہاں مراد ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنے بندوں کو ہدایت کرنے میں ان سے نرمی کرتا ہے۔ (غ)

خدا تعالیٰ کا جسم نہیں کہ نظر انسانی اس کا احاطہ کرلے اور نہ ہی عقل انسانی اس کی کنہ تک پہنچ سکتی ہے۔ حالانکہ جس قدر شریک ٹھہرائے جاتے ہیں وہ سب احاطہ نظر انسانی میں آجاتے ہیں۔ اس سے قیامت میں **اللہ تعالیٰ کی رؤیت** کی تردید نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہاں دوسرے قویٰ دیئے جائیں گے اور یہاں ان آنکھوں یا اس عقل کے عجز کا ذکر ہے۔

995- بَصَآىِٕرُ۔ بَصِیْرَةٌ کی جمع ہے اور قلب کی قوت مدرکہ کو کہتے ہیں۔ (غ) مراد دلائل توحید باری تعالیٰ ہیں۔ میں حفیظ نہیں یعنی تمہارے اعمال کا نگران اور ان پر بدلہ دینے والا میں نہیں ہوں، خدا ہے۔

وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں جو جانتے ہیں۔ (996)

اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

اس کی پیروی کرتا رہ جو تیری طرف تیرے رب سے وحی کی گئی ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے کنارہ کر۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا' اور نہ تو ان کا کارساز ہے۔ (997)

996- دَرَسْتَ۔ دَرْسٌ کے معنی ہیں اثر یا نشان باقی رہا اور چونکہ باقی رہنا مٹ جانے کو بھی چاہتا ہے اس لیے دُرُوْسٌ کے معنی مٹ جانا بھی آتے ہیں اور [دَرَسَ الْعِلْمَ] کے معنی ہیں حفظ کر کے اس کے نشان کو پالیا۔ (غ) اور [دَرَسْتُ الْكِتَابَ] کے معنی ہیں اس کو بار بار پڑھ کر مطیع کر لیا یہاں تک کہ اس کا یاد رکھنا آسان ہو گیا۔ (ل)

لِيَقُوْلُوْا میں لام عاقبت ہے یعنی جب باتوں کو طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا جاتا ہے، کبھی فطرت انسان کی طرف اور کبھی قانون قدرت کی طرف اور کبھی امم سابقہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ باتیں پچھلی تعلیم سے لی ہوئی ہیں اور خوب کوشش کر کے ان کو یاد کر لیا ہے۔ مگر صاحب علم لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ امر حق کو پہچان لیتے ہیں اور یہ جان لیتے ہیں کہ مختلف قسم کے دلائل ایک ہی نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ یہی اس کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔

997- شَآءَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 32]، اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور اس کا پالینا ہیں۔ دوسرے معنی ارادہ کے مرادف ہیں۔ ارادہ میں شے کا وجود میں لانا لازم نہیں گو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہو۔ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: 185:2] ''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔'' اور انسان کا ارادہ ہو سکتا ہے بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس چیز کے لیے ہو۔ جیسے انسان چاہتا ہے کہ نہ مرے۔ اور یہ ارادہ الٰہی کے خلاف ہے اور مشیت کے لیے پہلے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ہونا لازمی ہے۔ ﴿وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [الدهر: 30:76] ''اور تم نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ اللہ (تعالیٰ) چاہے۔'' (غ)

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا﴾ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو یہ شرک نہ کرتے۔ اور دوسری جگہ کفار کا قول منقول ہے ﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا﴾ [الأنعام: 148:6] ''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے۔'' حالانکہ کفار کے قول کی تردید کی ہے ان دونوں مقامات میں فرق یہ ہے کہ کفار کے قول کا منشا تو یہ ہے کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہم شرک

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

اوران کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں (ایسا نہ ہو) کہ وہ زیادتی کر کے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں۔ اسی طرح ہم نے ہر ایک گروہ کے لیے ان کا عمل اچھا کر کے دکھایا ہے۔ پھر ان کے رب کی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے سو وہ انہیں بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔ (998)

کریں۔ اس لیے ان کو جواب بھی یوں دیا ہے ﴿فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [الأنعام: 149:6] ''سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا'' یعنی اگر مشیت سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور کرنا ہوتا تو ہدایت پر مجبور کرتا نہ شرک پر جیسا کہ دوسری مخلوق کو اپنی فرمانبرداری کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ اور اس جگہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو وہ شرک نہ کرتے، تو مطلب یہی ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں پیدا ہی ایسا کرتا کہ تم نافرمانی نہ کر سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انسان کا سارا شرف دوسری مخلوق پر اڑ جاتا۔ اس لیے ﴿وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا﴾ یہاں فرمایا کہ تم انہیں مجبور کر کے شرک نہیں چھڑا سکتے۔ اگر مجبور ہی کرنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیدائش میں ہی ان کو مجبور کر دیتا۔ مگر اس کی مشیت ایسی نہیں ہوئی۔ اس نے قانون بنا کر راہ دکھادی۔ اب انسان کا اختیار رہا اس پر چلے یا نہ چلے۔ شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ آخر شرک ان سے مٹ جائے گا۔

998- **دوسرے معبودوں کو گالیاں نہ دینے کی تعلیم:** مخالفین کی باتیں نہایت درجہ دکھ دینے والی تھیں۔ برا کہتے تھے، ہنسی اڑاتے تھے، گالیاں دیتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو اب ایک اصول بتایا کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کے معبودان باطل کو اسی طرح سب وشتم کرنے لگو۔ اور چونکہ یہاں شرک کی برائیوں کا ذکر تھا اس لیے ساتھ ہی یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرے کے عقائد میں جو برائی ہو اس کی اصلاح کے لیے اس کا بیان کر دینا تو ضروری ہے مگر حد سے تجاوز نہ ہو، گالی تک نوبت نہ پہنچے۔ ایک غلطی کا اظہار اور چیز ہے جس کی ضرورت ہمیشہ دنیا میں رہے گی مگر خواہ مخواہ برے الفاظ سے دوسرے کے دل کو دکھ پہنچانا جائز نہیں۔ یوں قرآن کریم ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم بھی دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایسا عمدہ اصول بیان کر دیا ہے کہ جس سے مذہبی تنافر کی بجائے انسانوں میں باہم محبت پیدا ہو۔ عام طور پر اس اصول کو مدنظر نہ رکھنے سے مذہب کی خاطر انسان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ حالانکہ مذہب کی غرض یہ تھی کہ تمام انسانوں سے محبت اور آشتی ہو۔ اس زمانہ میں عیسائیوں اور آریوں نے اس اصول کو توڑ کر باہم بغض وتنفر کا خطرناک بیج بو دیا ہے۔ سینکڑوں کتابیں صرف دوسروں کی برائیاں بیان کرنے، ان پر ہنسی کرنے پر شائع ہوتی ہیں۔ اصول سے بحث نہیں کیونکہ وہاں اپنی کمزوری کو جانتے ہیں۔

تزئین اعمال:

عَمَلَهُمْ سے مراد ان کا وہ عمل ہے جو ان کو کرنا چاہیے۔ وہ باتیں جو انسان کی بھلائی کا موجب ہیں ان کو قرآن کریم نے نہایت

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور وہ بڑے زور کی قسموں کے ساتھ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس نشان آئے تو ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ نشان صرف اللہ کے پاس ہیں اور تمہیں کیا خبر ہے کہ جب وہ (نشان) آئیں گے تو یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (999)

وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ع 13 10 19

اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے جس طرح وہ اس پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں بہکا ہوا چھوڑ دیں گے۔ (1000)

خوبصورت بنا کر دکھایا ہے تا کہ لوگ ان پر عمل کریں۔ جیسے یہی اصول کہ جن کی دوسرے لوگ عزت کریں تم انہیں گالی مت دو۔ جو برے عمل انسان کرتا ہے وہ بھی اس کو بعض وقت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مزین کرنے والا خدا نہیں بلکہ شیطان ہے جیسا کہ صاف فرمایا ﴿وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الأنعام: 43:6] ''اور شیطان نے اسے ان کے لیے خوبصورت کر دکھایا جو وہ کرتے تھے۔'' ایسا ہی [دیکھو آیت: 137] جہاں برے کام کی تزئین شیطان کی طرف منسوب کی ہے۔

999- اس قدر کھلے دلائل کے باوجود پھر وہی نشان مانگتے ہیں [دیکھو آیت: 35] فرمایا ایسے معجزات بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں۔ لیکن جو قوم اس قدر کھلے دلائل کو رد کر رہی ہے وہ ان معجزات سے کیا فائدہ اٹھائے گی۔ اس آیت سے انکار معجزات نکالنا آیت کے صریح منطوق کے خلاف ہے۔ ﴿اِذَا جَآءَتْ﴾ کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ جس قسم کے معجزات وہ چاہتے ہیں وہ بھی ان کو مل جائیں گے مگر ایمان تو دلائل سے ہی پیدا ہوگا نہ معجزات سے۔

نُقَلِّبُ۔ قَلَّبَ کے معنی ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف پھیرنا ہیں۔ اور تَقْلِيْبٌ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرتے رہنا۔ [تَقْلِيْبُ اللهِ الْقُلُوْبَ وَالْبَصَائِرَ] کے معنی ہیں [صَرَفَهَا مِنْ رَأْيٍ اِلٰى رَأْيٍ] ان کا ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف پھیرتے رہنا۔ (غ) یعنی کبھی کچھ خیال کرنا کبھی کچھ۔

اَفْـِٕدَةَ۔ فُؤَادٌ کی جمع ہے فَأَدَ کے معنی ہیں بھونا یا جلایا۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے دل کو فُؤَادٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) اور فُؤَادٌ بعض کے نزدیک دل کا بیرونی پردہ ہے اور قلب اس کا مرکز۔ (ل)

1000- نَذَرُ۔ وَذَرَ اس کا مادہ ہے مگر اس کی ماضی استعمال میں نہیں آئی اور [يَذَرُ الشَّيْءَ] کے معنی ہیں ایک چیز کو بے حیثیت سمجھ کر اسے پھینک دیا۔ ﴿وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا﴾ [الأعراف: 70:7] ''اور اس کو چھوڑ دیں جس کی ہمارے باپ دادا

عبادت کرتے تھے۔'' ﴿وَيَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ﴾ [الأعراف: 127:7] ''اور وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے۔'' ﴿فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ﴾ [الأنعام: 112:6] ''سوان کو چھوڑ دے اور اسے جو وہ افترا کرتے ہیں۔'' ﴿وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا﴾ [البقرة: 278:2] ''اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔'' ﴿وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ [البقرة: 240:2] ''اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں۔'' (غ) آخری موقع پر اس لفظ کے استعمال میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ عورت کی حیثیت نہایت درجہ کی کسمپرسی کی رہ جاتی ہے اس لیے اس کی بے کسی کی طرف توجہ دلا کر وہاں اس کے حق میں کچھ وصیت کی سفارش فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف دلوں اور آنکھوں کے پھیرنے کی نسبت ویسی ہی ہے جیسے از دیادِ مرض کی [دیکھو نمبر: 22] افعال انہی کے ہیں مگر نتیجہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اور ان کے افعال ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ ﴿لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ کا نتیجہ اسے بتایا۔ پہلے ایمان نہیں لائے نتیجہ یہ ہے کہ اب کبھی ایک رائے بدلتے ہیں کبھی دوسری اور سرکشی میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ چونکہ پہلے ایمان کی طرف انہیں دلائل سے بلایا تھا اور دلائل کو انہوں نے قبول نہ کیا، پھر معجزات دیئے تو کبھی ساحر کہا، کبھی کاہن کہا، کبھی کچھ کہا، یہی [تَقْلِيْبِ اَفْئِدَةِ] ہے۔ حقیقت کی طرف دلائل رہنمائی کرتے ہیں، معجزات محض تائیدی امور ہیں۔ ان سے وہ شخص کیا فائدہ اٹھائے گا جو دلائل پر غور نہیں کرتا۔